A Critical Review OF Modern Urdu Poets

M ANEES QARI

اُردو کے جدید شعراء

ایک تنقیدی جائزہ

اَنیس قاری

عبداللہ پبلشرز

نام کتاب : اردو جدید شعراء - ایک تنقیدی جائزہ
تحریر و ترتیب : انیس قاری
ناشر : عبداللہ پبلشرز
کمپوزنگ : صائمہ خان
طابع : شرکت پرنٹنگ پریس
۴۳ نسبت روڈ لاہور ۔ فون: ۷۳۵۶۵۴۷

بار اول : اگست 1997ء

پبلشرز :- عبداللہ پبلشرز

انتساب

ثریا باجی کے نام

عقیدت کے ساتھ

دیباچہ

شاعری ہر زبان کا ایک اہم اور نہایت پرکشش حصہ ہوتی ہے۔ لندن یونیورسٹی نے اس دفعہ اردو جدید شاعری کو سلیبس میں شامل کر کے بہت سے اساتذہ اور طلبا کی دیرینہ خواہش کو پورا کر دیا ہے۔

تمام جدید شعراء کا اس کتاب میں شامل کرنا ہی ہمارے لیے مشکل تھا للذا ہم نے اس کتاب میں ان تمام شعراء کو شامل کیا ہے جو اے لیول اردو سلیبس میں شامل ہیں۔

لیکن ایک بات دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی کہ انہوں نے صنف نازک شاعرات کو اس میں بالکل شامل نہیں کیا۔ میرے چند رفقاء کی خواہش ہے کہ میں شاعرات کا کلام ضرور شامل کروں۔ للذا میں نے چند مشہور اردو شاعرات کا کلام اس میں شامل کیا ہے جن میں ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت میں بہت سے لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ جن میں خاص طور پر فاروق طارق صاحب، اشرف سلیم صاحب، تصور علی خاں صاحب، مولانا محمد احسن صاحب، محترمہ ثمینہ اختر اور محترمہ صائمہ خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب کے سلسلے میں آپ لوگوں کی رائے کا انتظار رہے گا تاکہ اگلا ایڈیشن کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

انیس قاری

فہرست

مخدوم محی الدین
اخترالایمان
ن م راشد
جوش
جاں نثار اختر
احمد فراز
احمد ندیم قاسمی
علی سردار جعفری

(6) شاعرات

ادا جعفری
کشور ناہید
فہمیدہ ریاض
پروین فنا سید
پروین شاکر
صائمہ خان
کتابیات

غزل

غزل اردو کی مقبول ترین صنف شعر ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہیں۔ ہرن کے منہ سے بوقت خوف جو درد ناک چیخ نکلتی ہے، اسے بھی غزل کہتے ہیں۔ اس نسبت سے غزل وہ صنف شعر ہے، جس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں درد و سوز بہت نمایاں ہوں۔

پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے۔ غزل کا مطلع ہونا ضروری ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں یعنی پوری غزل ہم قافیہ و ہم ردیف (یا صرف ہم قافیہ) ہوتی ہے۔ باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ بعض غزلیں غیر مردف (بغیر ردیف کے) بھی ہوتی ہیں۔ غزل کے آخری شعر (مقطع) میں شاعر بالعموم اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ بعض غزلوں کے درمیانی شعروں میں بھی تخلص لایا جاتا ہے، غرض ایسے امور میں غزل گو کو کسی قدر آزادی ہوتی ہے۔ مگر جدید شعراء غزل میں تعداد اشعار کی قید کو ایک بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔

عشق و عاشقی، غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے اور عموماً غزل میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات (مثلاً درد و غم، سوز و گداز، ہجر و وصال، محبوب کا ظلم و ستم، اس کی بے وفائی اور ناز و ادا وغیرہ) کا بیان ہوتا ہے تاہم غزل میں اتنی وسعت، رنگارنگی اور تنوع ہے جتنی کو زندگی یا کائنات متنوع اور وسیع ہے۔ اس ہمہ گیر کے سبب غزل میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی، فلسفیانہ، حکیمانہ اور عاشقانہ موضوعات و مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا ہے یوں معنی کے اعتبار سے غزل میں بڑا لچک ہے اور اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جبکہ دیگر تمام اصناف شعر میں بالعمو تسلسل خیال پایا جاتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار پوری غزل میں اس کے چند شعروں میں موضوع یا خیال کا ربط تسلسل موجود ہوتا ہے، اس کو قطعہ بند غزل کہتے ہیں۔۔۔ لیکن غزل کی انفرادیت بہرحال یہی ہے کہ اس کا ہر شعر اپنا جدا مفہوم رکھتا ہے۔

نظم

کسی مفہوم کو لفظوں کی کسی خاص ترتیب سے پابند کر کے چھوٹی چھوٹی برابر قطاروں میں اس طرح ادا کرنا کہ ان میں روانی اور ترنم ہو اور تسلسل قائم رہے نظم کہلاتی ہے۔ لفظوں کی ان قطاروں کو مصرعے اور ہر دو مصرعوں کو شعر کہا جاتا ہے۔
شعر کے لغوی معنی "جاننا بوجھنا" ہے۔ شعر ایسا کلام ہے جو موزوں ہو اور بالا ارادہ لکھا گیا ہو اور الفاظ کے ذریعے جذبات کا اظہار کرتا ہو۔
شاعری میں علم عروض کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس علم کے ذریعے کسی شعر کے وزن کی درستی کا پتہ چلتا ہے۔ وزن سے مراد دو کلموں کی حرکات و سکنات کا برابر ہونا ہے۔ بحر چند ایسے کلام موزوں کا نام ہے جن پر اشعار کا وزن کیا جاتا ہے۔
تقطیع میں کسی شعر کے مختلف حصوں کو بحر پر وزن کر کے دیکھنے کا نام ہے۔ قافیہ ایسے ہم وزن اور ہم آواز الفاظ ہوتے ہیں جو مصرعہ کے آخر میں ردیف سے پہلے آتے ہیں۔ ردیف ایسا لفظ یا لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو مصرعہ کے آخر میں قافیہ کے بعد مستقل طور پر بغیر تبدیل ہوتے آتا ہے۔ مطلع کسی غزل کے اس پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مقطع عموماً غزل یا نظم کا آخری شعر ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا نام استعمال کرتا ہے جسے تخلص کہتے ہیں۔

قصیدہ

لفظ قصیدہ عربی لفظ "قصد" سے بنا ہے، اس کے لغوی معنی قصد (ارادہ) کرنے کے ہیں۔ گویا قصیدے میں شاعر کسی خاص موضوع پر اظہار خیال کا قصد کرتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی مغز کے ہیں یعنی قصیدہ اپنے موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے دیگر اصناف شعر کے مقابلے میں وہی نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی جسم و اعضا میں سر یا مغز کو حاصل ہوتی ہے۔ فارسی میں قصیدے کو "چامہ" بھی کہتے ہیں۔
اردو شاعری میں قصیدے کی روایت فارسی سے آئی ہے اس لیے معنی و ہیئت دونوں اعتبار سے اس پر فارسی قصائد کا اثر نمایاں ہے۔ اردو میں یوں تو ہر شاعر نے قصیدے لکھے مگر

ضروری نہیں کہ ہر اچھا شاعر اچھا قصیدہ نگار ہو، چونکہ قصیدہ دیگر اصناف شاعری کے برعکس اپنا مخصوص اور منفرد مزاج رکھتا ہے۔ اس لیے صرف وہی شاعر قصیدے لکھنے میں کامیاب ہوئے جنہیں قصیدے کے مزاج سے فطری مناسبت تھی۔

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مرنے والے کی تعریف و توصیف۔ گویا مرثیہ ایسی صنف شعر ہے جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اس کی تعریف حسرت اور غم کے انداز میں کی جاتی ہے۔
اردو شاعری میں مرثیہ وہ واحد صنف شعر ہے۔ جو عربی یا فارسی سے مستعار نہیں (اردو مرثیہ فارسی مرثیے سے بالکل ایک مختلف چیز ہے) یہ اردو شعرا کی اپنی ایجاد ہے۔
مرثیے میں دیگر اصناف شعر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں یعنی ایک مرکب صنف ہے جس میں قصیدے کی طرح مختلف انسانوں اور چیزوں کی مدح کی جاتی ہے۔ مثنوی کی طرح واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور نظم کی طرح منظر نگاری اور غزل کی طرح جذبات نگاری ہوتی ہے، اس کے باوجود مرثیے کا انفرادی رنگ قائم رہتا ہے۔
مرثیے کے لیے ضروری ہے کہ
ایک ہی موضوع یعنی رنج و غم اور ماتم کے بیان میں تنوع ہو ورنہ یکسانیت کے سبب مرثیہ دلکشی کھو بیٹھے گا۔

گیت

گیت گانے کی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے گیت میں سر تال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔
اصطلاح میں گیت وہ صنف شعر ہے جس میں ایک عورت، مرد کو مخاطب کر کے اظہار محبت کرتی ہے۔ گیت میں جذبات و احساسات خصوصاً ہجر اور فراق کی کیفیت بڑے والہانہ انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ بعض گیتوں میں محبت کا اظہار مرد کی طرف سے بھی ہوتا ہے مگر گیت کا

بنیادی مزاج یہی ہے کہ وہ محبت میں مبتلا ایک عورت کے دل کی پکار ہے۔

اردو گیت کی بنیاد ہندی گیت پر ہے۔ لہٰذا اس کی فارم اور زبان و بیان پر ہندی گیتوں کا اثر ہے۔ اردو گیت میں بھی ہندی کے الفاظ، خالص ہندوستانی تلمیحات اور مقامی موسموں، درختوں اور پھلوں وغیرہ کے نام بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ گیت کا لہجہ نسائی اور دھیما اور الفاظ نرم اور سبک ہوتے ہیں۔ گیت کا مجموعی مزاج نسوانی اور مقامی ہے۔ گیت کی کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں۔

جدید اردو شاعری

جدید اردو شاعری سے کیا مراد ہے؟ --- یہ ایک الجھا ہوا سوال ہے۔ الجھن لفظ "جدید" سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر دور کی شاعری اپنے زمانے میں جدید کہلاتی رہی ہے اور وہ دور گزرنے کے بعد قدیم۔ اگر محض زمانی اعتبار سے کسی قسم کی شاعری کو ہم جدید قرار دیں گے تو یہ الجھن ہمیشہ برقرار رہے گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ پہلے جدید شاعری کی تعریف متعین کر لی جائے۔

کچھ لوگ اردو کی آزاد نظم کو نئی شاعری قرار دیتے ہیں۔ گویا زندگی کا سیاسی اقتصادی یا جنسی پہلو ان کی نظر میں نئی شاعری کا خام مواد ہے۔ دراصل نئی شاعری ہر اس کلام موزوں کو کہا جا سکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا انداز ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے الگ رہ کر احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پرانا۔ اس لحاظ سے اردو ادب کی تاریخ میں نئی شاعری کا سنگ بنیاد نظیر اکبر آبادی نے رکھا۔ نظیر سے پہلے بھی بعض شعراء نے نئے راستوں پر چلنے کی کوشش کی لیکن ماحول پر اپنے اثر کے لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ صحیح معنوں میں نظیر ہی نئی شاعری کا نمائندہ ہے۔ نظیر کے بعد اگرچہ غالب ایک ایسا سنگ میل ہے جس کی انفرادیت کا اثر اب تک جاری ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

اردو شاعری میں روایت کا مطلب مشترکہ علامات، مشترکہ حکایات، عشق و محبت کا ایک مقررہ رویہ، بندھا ٹکا اسلوب اور زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں مکمل اجنبیت تھا۔ ان نئے شاعروں نے اپنے انفرادی انداز پر زور دیا۔

ان میں میراجی کا ذکر سب سے پہلے ضروری ہے جنہوں نے سب سے پہلے آزاد نظم کو دھڑے سے استعمال کیا اور کیا موضوع! کیا اسلوب! ہر اعتبار سے جدت کو اپنا شیوہ بنایا۔ میراجی انگریزی سے بھی واقف تھے اور ہندو دیومالا سے بھی انہیں آگاہی تھی۔ ان سب چیزوں کا اثر ان کی شاعری پر نمایاں ہے۔

ن م راشد کا پہلا مجموعہ کلام "ماورا" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو ادب میں پہلا باقاعدہ مجموعہ تھا جو آزاد شاعری کی تحقیقات پر مشتمل تھا۔ اس میں جدید سماجی اور سیاسی تعلقات کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار ہے۔

انہیں کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند تحریک کے شعراء نے بھی جدید اردو شاعری کو اپنی نظموں سے

مالامال کر دیا۔ اس تحریک کے بڑے شعراء میں فیض، فراق، علی سردار جعفری، مجاز، ساحر، احمد ندیم قاسمی، جندلی، کیفی، اعظمی، مخدوم محی الدین اور کچھ ان سے چھوٹے درجے کے شعراء شامل تھے۔ ترقی پسندوں نے ایک مدت تک جوش ملیح آبادی کو اپنا امام بنائے رکھا جنہوں نے تحریک کے مقاصد سے متاثر ہو کر بڑی گھن گرج والی شاعری کی۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں جدید شعراء کی ایک نئی نسل ابھری جس کی نمائندگی شہرت بخاری، شہزاد احمد، ظفر اقبال، ناصر کاظمی اور منیر نیازی کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل میں نئے نئے موضوع سموئے اور اس طرح اس کے امکانات کو وسیع کیا۔

اردو غزل

غزل اردو کی مقبول ترین صنف شعر ہے۔ لفظ غزل کی تشریح مختلف طریقوں پر کی گئی ہے۔ اردو غزل، فارسی غزل کی مرہون منت ہے۔ ولی دکنی اردو کا پہلا قابل ذکر غزل گو ہے۔ غزل کے ارتقاء میں میر، سودا، درد، انشاء، جرات، مصحفی، آتش، غالب، ذوق، ظفر، داغ، حالی وغیرہ قابل قدر حصہ ہے۔ انشاء، جرات، رنگین اور ناسخ لکھنوی دبستان غزل کے نمائندے ہیں جن کے ہاں حسن و عشق کا خارجی اور جسمانی پہلو غالب ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں فحش اور بازاری قسم کے شعر بھی ملتے ہیں اور مشکل پسندی اور ظاہری آرائش کا غلبہ ہے اس کے برعکس میر، درد، ظفر، شیفتہ اور حالی وغیرہ دبستان دہلی کے نمایاں گو ہیں۔ ان کے ہاں داخلی و قلبی احساسات کو دھیمے اور پر سوز لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اپنے رنگ میں منفرد غزل گو ہیں۔

جدید غزل کے بانی حالی ہیں انہوں نے مبالغے سے اجتناب اور حقیقت نگاری پر زور دیا ہے۔ غزل کی تقلیدی روش کی اصلاح کے سلسلے میں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

میراجی

(1912-1949)

نام : ثناءاللہ ڈار

ادبی نام : میراجی

پیدائش : 25 مئی 1912ء

تعلیم : میٹرک پاس نہ کیا

وجہ شہرت : بانی حلقہ ارباب ذوق لاہور

ملازمت : آل انڈیا ریڈیو میں بطور سکرپٹ رائٹر، شعبہ فلم سے منسلک ہوئے۔ کتاب پریشاں، باتیں کے عوان سے ماہنامہ "ساقی" میں کالم لکھے۔

تخلصات : میراجی، سندھور

ادبی نام : ادبی گاندھی (یہ نام ن۔ م راشد نے دیا تھا)

وفات : 3 نومبر 1949ء

مجموعہ کلام : "کلیات میراجی"۔ "میراجی کے گیت"۔ "گیت ہی گیت"۔ "میراجی کی نظمیں"۔ "پابند نظمیں"۔ "تین رنگ"۔

تنقید : مشرق و مغرب کے نغمے۔ (ترجمہ شاعری)

تصانیف : تراجم۔ نگار خانہ : سنسکرت شاعر دامودر گپت نٹنی مقم کا نثری ترجمہ، خیمے کے آس پاس، عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ۔

میراجی کی شاعری

میراجی کی شاعری کا لب ولہجہ ایک انوکھی دلفریب زبان و بیان احساس و فکر، نئے استعارات

وعلامتوں کا غماز ہے جو قاری کو ایسا سرور، مٹھاس وحلاوت دیتا ہے کہ قاری گنج ہائے معنی میں ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے مثلاً دیکھئے گیت " آیا بیرن مورا رے" میں :-

دھرتی پر چھائی ہریالی
آئی گھٹائیں کالی کالی
گھر بھر میں اجیارا چھایا
پل میں بندھائی دھیر
آیا بیرن مورا رے
آیا بال پنے کا سنگی
لایا چوڑیاں رنگ برنگی
پونچی لایا، جھانجھن لایا
چاندی کی زنجیر
لایا بیرن مورا رے
پھر ساون من بھاون آیا

میراجی اپنے انفرادی فکر جنس کو اخلاق و رسم کے تنگ گھیرے میں قید کرنے کی بجائے اسے حیات و کائنات پر پھیلا دیتے ہیں کیونکہ جنس جبلی ان کے نزدیک عطیہ خداوندی ہے۔ وہ جنسی نقطہ نظر سے پرہیز کی دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور جو فطرتاً درست و صحیح ہے اور یہی آدرش میراجی بھی ہے۔ اظہار جنس جس قدر ہمیں میراجی کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ شاید ہی اس زمانے کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں مل سکے۔ میراجی کی جنسیت ایک تقدس وپاکیزگی کی شان نرالی سے جلوہ فرما ہے۔ وہ عورت کی بجائے تصور عورت کو جان از عزیز خیال کرتے ہیں۔ وہ علامات کے ذریعے بھی اپنے آدرشی نقطہ نظر یعنی جنس کی مقصد برآمدی کے لیے انہیں استعمال کرتے مثلاً لباس، ٹیلہ، بادل، آبشار وغیرہ اپنے ہیجانی تصور حیات یعنی جنسیت کے متعلق خود ہی رقمطراز ہیں کہ

"جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب وتمدن نے جمع کر رکھی۔ وہ مجھے ناگوار

گزرتی ہے اس لئے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی ہربات کو تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو میرا آدرش ہے۔"

تخلیقی لحاظ سے میراجی خود اذیتی و جنسی ناآسودگی کی بدولت جنسیت کا چلتا پھرتا اشتہار سمجھے جاتے تھے لیکن اس سچے اور کھرے عاشق کے پاس ایک آئینہ شفاف سا دل بھی تھا جو حسین و دلکش تصورات میں کھو کر اپنے سادہ لوح دل کی باتیں "اجالا" میں یوں بیان کرتا ہے کہ

آشا آئی سارے دن کے دکھ اک پل میں مجھ کو بھولے
جیسے کوئی ساون رت میں پھلواری میں جھولا جھولے
کومل لہریں میرے من میں ایک انوکھی شوبا لائیں
جیسے اونچے نیلے ساگر میں دور کونجیں اڑتی جائیں

میراجی کے کلام میں غزلیات بھی موجود ہیں۔ مگر ان کا نظمیہ انداز ان پر بھی غالب ہے اور غزل جیسی تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتیں لیکن پھر بھی تغزل سی کیفیت ضرور ہے۔ ان کی شاعری کا انساں تہذیب نو کے گہرے دکھ، خوف، بے اعتمادی کا پروردہ ہے۔ وہ اسی مضطرب و مجبور و مقہور انسان کو موضوع سخن بناتا ہے جس میں اس کی اپنی ذات پریشاں بھی آشکار ہے کہ

پیاروں سے مل جائیں پیارے انہونی کب ہونی ہوگی
کانٹے کب پھول بنیں گے کیسے کب سکھ سیج بچھونا ہوگا

میراجی کی غزلوں کے چند اشعار :-

پیاروں سے مل جائیں پیارے انہونی کب ہونی ہو گی
کانٹے کب پھول بنیں گے کیسے کب سکھ سیج بچھونا ہو گا

غم کے بھروسے کیا کیا چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور بھی کچھ سامان کریں
میر ملے تھے میرا جی سے باتوں سے پہچان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا
سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے من موجی ہے مستانہ
ہر لہر سے جامہ ٹپکا، ساگر گہرا بھول گیا

اسرار الحق مجاز

(1911ء-1955ء)

نام :	اسرار الحق
قلمی نام :	مجاز
ولادت :	ردولی بارہ بنکی (اودھ) لکھنؤ ہندوستان
تعلیم :	بی اے-1946
وفات :	1955ء، شراب پینے سے-
ملازمت :	لائبریرین ہارڈنگ لائبریری دہلی آل انڈیا ریڈیو
اعزاز :	1956ء ماہنامہ افکار نے ان کے اعزاز میں مجاز نمبر شائع کیا-
شعری مجموعے :	"آہنگ" 1938ء- "سازنو" 1949ء

شاعری کی خصوصیات

مجاز کو لوگوں نے مختلف القابات سے نوازا ہے مثلاً رومانیت کا شہید، بلبل رنگین نوا، مغنی آتش نوا، ادب اردو، کا شیلے، کیٹس وغیرہ لیکن مجاز نے خود اپنے لئے "مطرب بزم دلبراں" کا لقب منتخب کیا ہے جیسے کہ یہ شعر

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعری محفل وفا، مطرب بزم دلبراں

مجاز میں ادبی وانقلابی رجحان سے دلچسپی پیدا کرنے کیلئے علیگڑھ یونیورسٹی کی بہترین وسازگار فضاہی دراصل مجاز کی زندگی کا روشن باب ہے- ماحولیاتی اثرات کے تحت مجاز کی شاعری انقلاب اور ہیجان انگیز خیالات کا (پیش خیمہ ہے یا نتیجہ ہے) انہوں نے نظموں کے علاوہ غزل کے میدان میں بھی کمال دکھایا ہے- غزیہ انداز نوجوان امنگوں و خواہشات کا ترجمان

ہونے کی بدولت نئی نسل کا دل پسند انداز ہے۔ غزلیہ انداز نگارش نرم و نازک، شگفتہ، پر کیف، جذبات شوق سے پر، رسیلہ اور غنائی ہے۔ مجاز کلاسیکیت کے علاوہ روایات کے بھی ترجمان ہیں۔ انہوں نے لکھنوی طرز غزل میں صرف مسی، چوٹی کنگھی اور محبوب دلفریب کے جلوے ہی نہیں دکھائے بلکہ اس میں سماجی عنصر کو شامل کرکے غزل کی حدود بڑھا دی ہیں۔ غزلیات مجاز میں شاید ہی ایسا کوئی شعر ہو جو بے معنی ہو۔ ان کے کلام میں انسانی ہمدردی اور انسان دوستی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ مجاز بیک وقت ایک ایسے انقلاب کے متلاشی ہیں جو بیک وقت مادی و روحانی، آسودگی و خوشحالی کا حامل ہو۔ وہ غیر مساویانہ تقسیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان عناصر کی بھی بیخ کنی کرتے ہیں جو سماج کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ قلاش حال لوگوں سے ہمدردی کا اظہار اور سرمایہ دار امراء کے قصر ظلمت پر حملہ کرنے کا اظہار وہ اپنی نظم "ریل اور رات" میں نہایت فنکارانہ انداز میں یوں کر رہے ہیں کہ

ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھرائی ہوئی
دامن تاریکی شب کی اڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

مجاز کا تعیش کوئی فلسفیانہ نہیں وہ حسن سے متاثر ہیں۔ مجاز طوفان عشق میں بائرن (انگریزی اشعار) کی طرح جذبات تلاطم کے گرفتار ان جیسے ہیں اور مجاز وہ عاشق نامراد ہیں جو وصال محبوب سے محروم رہے۔ یہی ناکامی و محرومی محبوب دراصل ان کی اپنی بربادی کا سامان بنی۔ سو وہ رسوائے مہ و مسافر ہوئے اور عنفوان شباب میں موت کے گھاٹ اتر گئے۔ وہ محبت میں مکمل آزادی چاہتے ہیں جہاں کوئی معاشرتی جبر و قید نہ ہو اور محبوب دلبراں تک باسانی اپنا حال دل پہنچا سکیں چنانچہ یہی قید و جبر " نظم مجبوریاں" میں دکھاتے ہیں کہ

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری

کہ اسکے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

یا یوں بھی کہ

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

پھر ایسے ہی جذبات کا اظہار ان کی نظم "اندھیری رات کے مسافر" میں بھی ملتا ہے
مجاز کا شعری خمیر ساز، جام، شمشیر سے اٹھا ہے اور ان کی دلبری میں جادوگر کی سی تختی ہے۔
مجاز کی طبیعت میں سہل نگاری اور لاابالی پن کی وجہ سے شمشیر سے زیادہ ساز و جام کی جھلک نمایاں ہے نظم "انقلاب" کے ایک شعر پر نظر ہو کہ

چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خون آرزو

لیکن از روئے حقیقت یہ وقت ہی انہیں مجبور کر رہا ہے کہ نغمہ نشاط و طرب کی بجائے علی الاعلان وہ یہ سمجھا میں کہ

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

اور " آہنگ" کے پہلے شعر پر نظر ہو

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز مزاج کے اعتبار سے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ کبھی کبھار وہ خالصتاً تخریبی عناصر کی تلخی کو اپنے کلام میں یوں شامل کر دیتے ہیں جو ہر پستے اور روتے انسان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردعمل ہو جیسے کہ نظم " آوارہ " میں ان ستم رسیدہ لوگوں کا ظلم کرنے والوں سے

جذبہ، انقام کو نہایت خوبصورت پیرائے میں ابھارتے ہیں۔

مفلسی کے یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اور

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستان پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز بنیادی طور پر ایک غنائی شاعر ہیں۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس غنائیت کی بدولت ان کے کلام میں **خطیبانہ** کڑک نہیں بلکہ نغمہ سرائی کرنے والا افکار ہے۔ وہ محبت کی مدح سرائی کرتے ہوئے ہمیں بے فکری اور روح پرور دنیا کی سیر کرانے لگتا ہے مثلاً

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

مجاز نے غزل کو ایک نئی لے سے روشناس کرایا جو جذبہ انقلاب اور جذبہ عشق سے مل کر بنی تھی۔ غزلیہ آہنگ بانکپن، احساس سرمستی اور حسن کی رنگینی سے لبریز ہے اور یہاں ربط دل کی شکستہ جذبوں کا اظہار بھی ہے اور یہ جذبہ اظہار والہانہ و بے ساختہ ہے۔ مجاز تمام زندگی ایک ادائے بے نیاز سے زندگی کے دکھوں کو جھیلتا رہا۔ بے درد زمانے کے دکھوں کو اپنے پر کیف نغموں کی لے میں الاپتا رہا اور یہ راگ اچھوتا و انوکھا ہے کہ

مجھے سنے نہ کوئی مست بادہ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

میری بربادیوں کا ہم نشینو!

تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

یا۔۔

ارباب جنوں پر فرقت میں
اب کیا کہیے کیا کیا گزری

مجاز نے ابتداء میں فانی سے اصلاح لی مگر پھر انہوں نے اپنے ذوق کو رہبر بنایا۔ مجاز کی شاعری کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب حالی، آزاد، جوش، حفیظ، اقبال، اختر شیرانی وغیرہ منظر عام پر موجود تھے۔ ان سب شعراء کے اثرات انہیں وراثت میں ملے۔ مجاز کا زندگی کے متعلق زاویہ نگاہ لزوراور محدود ہے۔ اس لئے وہ مطرب انقلاب اور مغنی رومانوی شاعر ہیں۔ فانی کا فلسفہ و فکر ملاحظہ ہو کہ

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں

یا۔

دنیا جسے کہتے ہیں فانی
ہے اک عالم اجتماع اضداد

مجاز کا دنیا کے متعلق فلسفیانہ رنگ دیکھئے کہ

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے میں مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے، آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے، آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا، میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

وہ ساری عمر اک ادائے بے نیازی سے زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں سے کھیلتا رہا۔ زمانے نے اس کے ساتھ بے دردی کا سلوک کیا لیکن وہ فضا میں اپنے نغموں سے گلال اڑاتا رہا۔ وہ صحیح معنوں میں تخلیقی فنکار اور رومانی شاعر تھا۔

ساحرلدھیانوی

(1921ء-1980ء)

نام :	عبدالحئ
قلمی نام :	ساحرلدھیانوی
ولادت :	لدھیانہ (بھارت) 8مارچ1921ء
وفات :	25اکتوبر1980ء بمبئی
تصانیف :	"تلخیاں"، "گاتا جائے بنجارا"، "پرچھائیاں"، "آؤکہ کوئی پل کاشاعرہوں"، "میں پل دوپل کاشاعرہوں"
اعزازات :	پدم شری خطاب (بھارت)، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ (روس)، اردواکیڈیمی ایوارڈ (بھارت)، مہاراشٹر سٹیٹ لٹریری ایوارڈ (بھارت)، گولڈ میڈل گورنمنٹ کالج لدھیانہ (بھارت)، حکومت مہاراشٹر کی طرف سے جسٹس آف پیس، اسپیشل اگزیکٹیو مجسٹریٹ
ادارت :	"ادب لطیف"، لاہور، "سویرا" لاہور، "شاہراہ" دہلی

شاعری کی خصوصیات

ساحرلدھیانوی اردو کامقبول ترین شاعرہے۔اس کی مقبولیت کاسبب وہ رومانی شاعری ہے جس میں غنائیت اور نغمگی کے ساتھ ساتھ طنزکی بے پناہ کاٹ بھی موجود ہے اوریوں اس کی شاعری میں کھٹے اور میٹھے دونوں طرح کے ذائقے ملتے ہیں۔اس کی نظم "تاج محل" میں اس کی جھلک دیکھی اورکاٹ محسوس کی جاسکتی ہے۔اس نظم کایہ مصرعہ

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

کسی طورپربھی بے کسی اوربے بسی کااظہارنہیں بلکہ محبت کے اس طریق واردات پرگہراطنز ہےجوساحرجیسے عاشق کے لئے محبت کے سچے جذبوں کی ایک طرح سے توہین کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ محبت کسی نمودونمائش کی پابندنہیں ہوتی۔

علی سردارجعفری نے ساحرلدھیانوی کے اس جذباتی رویے کوسطحی قراردیاہےاوراسے حقیقت نگاری کی اچھی مثال قرارنہیں دیا۔مجھے اس بات سے اختلاف یوں ہے کہ ساحرنے اس طرح کی بے شمارنظموں میں حقیقت کاواضح طورپراظہارکیاہےاورکہیں بھی اعلیٰ جذبات کی سطح سے نیچے نہیں اترے بلکہ انہوں نے تاج محل کوجوبلاشہ ہندوستانی فن تعمیرکاشاہکارہے اس لئے کہ ناسورکہاہے کہ یہ یادگارمحبت کرنے والوں کاایک طرح سے مذاق اڑاتی رہتی ہے۔ہرعاشق نہ توتاج محل تعمیرکراکراپنی محبت کی صداقت کاثبوت بہم پہنچاسکتاہےاورپھراسی تیشے سے اپنی جان لے سکتاہےاوریوں بھی محبت بے لوث ہوتی ہےجودودلوں کے درمیان ایک صادق جذبہ ہے۔

ساحرلدھیانوی نے محبت کے اس جذبے کوارضی اورجسمانی بنایاہے۔اس کی نظموں میں جس محبوب کاذکرہےوہ تصوراتی اورخیالی نہیں بلکہ گوشت پوست کاایک ایساانسان ہےجواپنے اندرتمام دنیاوی جذبات واحساسات رکھتاہےجس میں محبتیں، نفرتیں اورزمانہ سازیاں سب شامل ہیں۔ساحرکی شاعری میں فکراورجذبے کاحسین امتزاج ملتاہے۔اس نے اپنی نظموں میں جذباتی شدت، شگفتگی اورتازگی ہی پیدانہیں کی بلکہ سماجی برائیوں کوبھی بے نقاب کیاہے۔یوں اس کی شاعری متحرک ہےاورسوسائٹی میں اپناکرداراداکرتی ہے۔

ساحربنیادی طورپرترقی پسندشاعرہےاوراس کی نظموں میں جورومانیت ہےاس میں بھی ایک احتجاج شامل ہے ایک ایسی احتجاجی رومانیت جوہمیں فیض کےہاں دکھائی دیتی ہے۔فیض کی طرح ساحربھی رومانیت کے تناظرمیں سماجی جبرواستبدادکی بات کرتاہے۔وہ پرانے لفظوں کو نیاروپ دیتاہے۔وہ رومانیت کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتااورنہ ہی اس کے سحرمیں کھو جاتاہے بلکہ وہ سماجی جبرکاکھلے بندوں اظہارکرتاہےاوریوں زندہ حقیقتیں اس کی شاعری میں دکھائی دیتی ہیں۔"میرے گیت"، "سوچتاہوں"، "مجھے سوچنے دو" میں اس کایہ اظہارکھل کرسامنے آتاہے۔

ساحرکی اکثرنظمیں فراق وجدائی کابے پناہ تخلیقی اظہارہیں مگردردوغم کی چاشنی کبھی قلب کی تسکین کاباعث ہوتی ہے۔یہ الگ بات کہ میٹھی کسک چھوڑجاتی ہے۔اپنی ان نظموں میں ساحر

آشوب تنہائی کا بھی شکار نظر آتا ہے۔ یوسف ناظم نے درست لکھا ہے کہ "ساحر کی شخصیت شکن آلود کپڑے کی طرح تھی اور ساحر نے ان شکنوں کو دور کرنے کی کبھی فکر نہیں کی۔"
ساحر کی زندگی میں ایک طرح کا ٹیڑھا پن تھا جسے اس نے کبھی سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ محبت کے معاملے میں بھی وہ اظہار تک کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ شاید وہ اسے بھی محبت کی توہین سمجھتا رہا ہو۔ اس نے زندگی کا سفر تنہا طے کیا ہے۔ اس تنہائی نے اس میں کہیں بھی بے حوصلگی پیدا نہیں کی۔ وہ اندر ہی اندر سلگتا رہا اس کا یہ باطنی سلگاؤ اس کی نظموں کے حوالے سے واضح ہو کر سامنے آتا ہے لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کہیں بھی یاسیت کا شکار نہیں ہوا، امید کی ایک کرن ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہے البتہ وہ مناسب وقت کے انتظار میں رہا مگر زندگی اور اس سے پیدا شدہ منفی اقدار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس کی نظم "شعاع فردا" اس کی بہترین مثال ہے۔

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروس فردا
حال، تاریک، سم افشاں سہی لیکن جی لے

ساحر کا لب ولہجہ بلند وبانگ ہے جس میں احتجاج اور بغاوت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ جبر واستبداد کی قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکاتا بلکہ ان کو اپنے بے پناہ طنز کا نشانہ بناتا ہے یوں اس کا خارجی رویہ ایک امن پسند کی صورت میں سامنے آتا ہے، وہ ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے۔

نہ منہ چھپا کے جیئے اور نہ سر جھکا کے جیئے
ستمگروں کی نظر سے نظر ملا کے جیئے
اب ایک رات اگر کم جیئے تو کم ہی سہی،
ہم ان کے ساتھ تھے جو مشعلیں جلا کے جیئے

ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں

ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیاء بخشی ہے

امن پسندی کے اس رویے نے اس کے ہاں جنگ سے شدید نفرت کا احساس پیدا کیا ہے اس کی طویل نظم پرچھائیاں اس کے اس احساس اور جذبے کا خوبصورت اظہار ہے۔ جس میں اس پر آتش فشانی اور رنگین بیانی دیکھی جا سکتی ہے۔ علی سردار جعفری کے بقول "ساحر کی نظم امن عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔"
امن اور آشتی کا یہ رویہ اور محبت کے چراغ جلانے کا احساس ساحر کی شاعری کا بنیادی موضوع ٹھہرتا ہے۔ رومانیت کے پردے میں اس نے جو احتجاجی رویہ اپنایا ہے اور جس طرح اپنے خیالات وافکار کی ترجمانی کی ہے۔ وہ اسی کا ہی حصہ ہے۔ وہ بلاخوف استحصال پسند قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اور تمام منفی اقدار کو ملیامیٹ کرنا چاہتا ہے۔ وہ منافقت کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور دنیا سے ہر طرح کے شر اور برائی کا خاتمہ چاہتا ہے اور انسانیت کے لئے خیر کا طالب ہے قحط بنگال ہو کہ مسلم کش فسادات اردو دشمنی ہو یا اشتراکیت کا فلسفہ وہ کھلے ڈلے انداز میں استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ گاندھی ہو کہ غالب ہو، لینن اور جشن غالب اس کا خوبصورت اظہار ہیں۔
ساحر لدھیانوی اپنی نظموں کے بیشتر موضوعات کی روشنی میں رجائی شاعر ہے اس کی نظم "نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو" اس کے احساس امید اور روشن اجالوں کی بشارت ہے۔ نظم "آؤ کہ کوئی خواب بنیں۔" بھی اس جذبے کی مظہر ہے۔
غرض ساحر لدھیانوی اپنی نظموں کے حوالے سے پیار اور محبت کے لطیف جذبوں کا شاعر ہے ایک ایسی محبت جس کے لئے وہ ساری زندگی تڑپتا رہا اور یہی تڑپ اس کی شاعری میں وہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے کہ ساحر کا ذاتی غم سب کا غم بن جاتا ہے۔ محبت کی یہ ناکامی اس کی کامیابی ہے کہ درد وفراق کی یہ لے اس کی شاعری میں اس طرح رچ بس گئی ہے اور اس میں ایک ایسی میٹھی کسک پیدا ہوئی ہے جو قاری کے دل ودماغ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی اور یوں تنہا ساحر سب کا ساحر بن جاتا ہے اور اسی میں ہی اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔

لدھیانوی جب وہ نظم کو اس بند پر ختم کرتا ہے تو پڑھنے والا جدید انداز فکر اور سماجی مساوات کے اس شاہکار کو حرف جاں بنالیتا ہے۔ مثلاً

تو میری جان مجھے حیرت و حسرت سے دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہانگیر نہیں

تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

امن کے موضوع پر اس کی طویل نظم "پرچھائیاں ہمارے ادب میں گرانقدر اضافہ ہے اس کی آخری نظموں میں دو نظمیں " آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو " جو اس نے لینن پرائز ملنے پر دنیا بھر کے انسانوں کے خراج تحسین کے جواب میں لکھی تھی اور ایک نظم "اے شریف انسانو" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم کا موضوع بھی "جنگ" اس سے پیدا شدہ "ہولناکیاں" اور "امن کی تلاش" ہے۔ اس نظم میں بھی "پرچھائیاں" کی طرح اس کا مقصد امن عالم کی تبلیغ ہے۔ چند مثالیں :-

جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
خون اپنا ہو یا پرایا ہو
ابن آدم کا خون ہے آخر

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ساحر کے کئی اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی
دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو نظم گلستاں پہ اختیار نہیں

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کسی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

ساحر کے دوسرے اہم موضوع محبت پر "یکسوئی" شاہکار "فن کار" کبھی کبھی "ہراس" "متاع غیر" اور "خوبصورت موڑ" پیار بھرے دلوں میں گھر کر جانے والی نظمیں ہیں۔
ساحر ہر چند کہ محبت میں ناکام رہا اور اپنی تنہائی میں زندگی بھر کسی کو شریک کرنے سے محروم رہا یا جھجکتا رہا لیکن اس نے دوسروں کو بھرپور محبت کا احساس دیا اور اس کا جواب بھی ملا لیکن اپنے خوبصورت نہ ہونے کے کامپلیکس نے اسے عمر بھر پہل کرنے سے باز رکھا۔ بین الاقوامی

شہرت یافتہ شاعرہ اور ادیبہ امرتا پریتم کی سوانح "رسیدی ٹکٹ" سے چند اقتباسات ساحر کی زندگی کے اس پہلو کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔

"بیس اکیس برس کی تھی، جب قیاسی چہرہ اس زمین پہ دیکھا تھا۔ 1957ء میں جب اکادمی ایوارڈ فون پر خبر سنتے ہی سر سے پاؤں تک میں تاپ میں جھلس گئی۔ خدایا یہ "سینٹرے" میں نے کسی انعام کے لئے تو نہ لکھے تھے۔ جس کے لئے لکھے تھے اس نے پڑھے۔ اب کل عالم بھی پڑھ لے تو مجھ کو کیا۔ اس روز شام کو ایک پریس رپورٹر بھیجا، فوٹوگرافر بھی وہ جب تصویر لینے لگا اس نے کاغذ اور قلم کے ذریعے وہ لمحہ گرفت میں لینا چاہا جو کسی نظم کا وقت تصنیف ہوتا ہے۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑ کر کاغذ پر نظم لکھنے کے بجائے ایک بے خودی کے عالم میں اس کا نام لکھنے لگ گئی جس کے لئے وہ "سینٹرے" لکھے تھے۔ ساحر ساحر..... سارا کاغذ بھر گیا"۔ ملک کی تقسیم سے پہلے تک میرے پاس ایک چیز تھی جو سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی یہ ساحر کی نظم "تاج محل" تھی جو اس نے فریم کروا کر مجھے دی تھی۔

ناصر کاظمی

(1925ء-1975ء)

نام : ناصر رضا
تخلص : ناصر
پیدائش : 8دسمبر1925ء انبالہ
مادری زبان : اردو
تعلیم بی۔اے نہ کیا
ملازمت ریڈیو پاکستان لاہور
مدیر : رسائل ماہنامہ "اوراق نو"، "ہمایوں"
آغاز شاعری : 1940ء
وفات 2مارچ 1972ء
شعری مجموعے "برگ نے"، "پہلی بارش"، "دیوان"، "نشاط جواب"۔

شاعری کی خصوصیات

پاکستان کے قیام کے بعد اردو غزل کے میدان میں کئی ایک نئی آوازیں ابھریں۔ مگر جو آواز اپنی انفرادیت تسلیم کروانے میں کامیاب رہی وہ ناصر کی آواز تھی۔ گو ناصر کی شاعری پر اساتذہ غزل کا رنگ واثر ہے جن میں میر، مصحفی، غالب، اقبال و فراق، فیض و جگر وغیرہ شامل ہیں مگر ناصر کی انفرادیت پھر بھی مسلم ہے۔ اشعار ناصر فنی ریاضت اور گہرے مطالعے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ناصر کی یادداشت ماضی کے گداز مناظر کو فراموش نہیں کرتی اور یہ یاد ماضی انفرادی کی بجائے اجتماعی ہے۔ ناصر ان شاعروں میں سے ہیں جو 1947ء کے واقعات سے از حد متاثر ہوئے۔ اس لئے شہروں کے لٹنے کا غم اور تہذیب کے مٹنے کا ماتم ان کے اشعار میں جا بجا ہوتا ہے۔ فسادات کی عکاسی پر ان کی اچھی خاصی غزلیں ہیں مثلاً

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

مزید

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں
گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
ہمسفر جو قافلہ میرا تھا
مثال گرد سفر گیا وہ

جاں کاہ اثرات کے ذکر پر یوں اشک بہاتے ہیں کہ

روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ناصر ذہنی کرب اور روحانی بے کیفی کو خارجی ماحول کے حوالے سے بیان کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ اداسی و تنہائی کی کیفیتوں کے بیان میں ان کا اچھوتا فن تعریف کے قابل ہے جیسے کہ

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر الفاظ کے مزاج سے گہری شناسائی رکھتے ہیں۔ وہ موقع محل کے مطابق ہندی، عربی اور فارسی کے لفظوں کو اپنے شعری پیکر میں ٹانک دیتے ہیں۔ صوتی اثرات کے تحت خاص فضا و ماحول کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا اپنا اسلوب و دلکشی ہے۔ بعض اوقات ناصر بار ہا ایسے الفاظ کو شعروں میں سموتے ہیں جو ہر بار نیا پس منظر اور نئے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں

جنگل، صحرا، طیور، شہر، بگولے، چشمہ، گل، جرس، خوشبو وغیرہ ہیں۔

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرس گل اداس کر کے مجھے

دل کی دھڑکن تیز ہونے کا سبب محبوب یاد بھی ہوتی ہے کہ

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

غزلیات ناصر کلاسیکیت کے تحت شعر میں توازن و اعتدال کی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں بھی مہارت رکھتی ہیں مثلاً

جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی
ان جلتی بلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لئے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لئے

ناصر کی غزلیں غم روزگار کی آئینہ دار ہونے کی وجہ سے کلیت و یاسیت کا شاہکار نہیں۔ وہ اس ناسازگاری ماحول کی تلخی کو صبر و حوصلہ سے برداشت کرنے کا درس دیتے ہیں یعنی

☆ پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصر
غم کو سہنے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے

ناصر کی غزل میر کی زود رنجی اور کیفیت نمائی فراق پر قائم ہے لہٰذا فراق کا اثر بھی کلام ناصر میں بکھرا پڑا ہے۔ فراق لفظوں کے ذریعے ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے مجمل خاکہ بن جاتا ہے مثلاً

خوشی انگلیاں چٹخا رہی ہے
تری آواز اب تک آ رہی ہے

ایک جگہ یوں بھی کہ

میں سو رہا تھا کسی کے شبستان میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

فیض احمد فیض

(1911ء-1984ء)

نام	فیض احمد
تخلص	فیض
پیدائش	13 فروری 1911ء سیالکوٹ
تعلیمی قابلیت	ایم۔ اے انگریزی، ایم۔ اے عربی
شادی	ایلس نامی خاتون سے ہوئی (دو بیٹیاں سلیمہ و منیزہ)
ملازمت	انگریزی کے معلم اور صحافی و ادیب تھے
ایڈیٹری کی	اخبار "پاکستان ٹائمز" رسالہ "لیل و نہار"
ادارت	"ادب لطیف"، "امروز"۔

سازش میں گرفتاری 9 مارچ 1953ء پانچ سال قید بامشقت کی سزا پائی۔

[illegible]	کمیونزم
ادبی پرائز	روس نے لینن پرائز عطا کیا۔
[illegible]	فلسطین کی جدوجہد آزادی میں تعاون کیا۔ "لوٹس" رسالہ نکالا۔ نظم "ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے"
وفات	20 نومبر 1984ء
مجموعہ	"نقش فریادی"، "دست صبا"، "دست تہہ سنگ"، "زندان نامہ"، "سر وادی سینا"، "شام شہر یاراں"، "میرے دل میرے مسافر"۔

شاعری کی خصوصیات

فیض کی شاعری بظاہر محدود اور قلیل ہے لیکن یہ اپنے اندر جہاں معنی سموئے ہوئے ہے جو اکثر د

بیشتر دیگر شعراء کی وسیع و عریض دنیا میں بھی نہیں ملتا۔

فیض کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور (رومانی دور) جس میں رومانی نظمیں اور عشقیہ شعر کہے۔ فیض نے یہ دور زیادہ تر تخلیقی دنیا میں گزارا۔ جہاں فیض عشق کی تلخ جامی اور حسینہ خیال کے رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی اور حسین آنکھوں کا شکار ہوئے۔ اس لئے یہ دور یاس و قنوطیت کا مظہر ہے۔ فیض روایت پسند شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ پرانے جسم میں نئی روح پھونکتے ہیں یعنی کائنات کے ہر ذرے پر عاشقانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہی تصور انہیں جاں آفریں و روح افزاء معلوم ہوتا ہے مثلاً

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

رومان پرور نظمیں جس میں "آخری خط"، "حسینہ خیال سے"، "مری جاں اب بھی"، "سرود شبانہ"، "انتہائے کار"، "آج کی رات"، "ایک رہگزر پر" قدیم و روایتی شعراء کا گہرا تاثر ابھرتا ہے لیکن تمام تصورات و احساسات شعری پر فیض کا جداگانہ رنگ غالب ہے۔ کلام فیض کا دوسرا عہد زندگی کے مشاہدہ و تجربہ کا غماز ہے۔ یہاں حقیقت سے فرار کی بجائے گہری وابستگی اور خلوص مترشح ہے۔ عقابی نگاہیں صدیوں سے روا ظلم و ستم، بہتی ہوئی پیپ اور رستے ناسوروں سے آشنا ہوتی ہیں تو فیض تڑپ اٹھتا ہے۔ شدید محبت ایک دم معدوم ہو کر خاک و خون میں لتھڑے اجسام اسے ہیبت زدہ کر دیتے ہیں۔ یہ کیفیت نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" سے واضح ہے کہ

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

فیض غریبوں کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے انہیں سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ذلیل و خوار زندگی پر موت کو برتر قرار دیتا ہے کیونکہ موت کے ذریعے ہی غم روزگار سے نجات ممکن ہے کہ

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

دوسرا دور فیض کی شاعری کا سنہری دور ہے کیونکہ شہرہ آفاق نظموں کی پیداوار یہی فکر ہے اور انہی کی بدولت فیض بام شعری میں نام دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

فیض کے خیالات کی سنجیدگی، شخصی توازن، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال نمایاں خصوصیات ہیں۔ شدت کی بجائے جذبے اور لہجے میں متانت ہے۔ شاعر کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ سیاسی و ملکی حالات و قومی تاثرات کو شاعرانہ انداز نہ دے۔ ویسے تو قدماء و متاخرین میں سے ہر ایک نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کی ہے لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی سیاسی تشریح کرنا شعر و شعریت کا خون کرنے کے برابر ہو گا۔ حسرت موہانی، جوش، مجاز، علی جواد، سردار جعفری، ن۔ م راشد، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین نے اپنی شاعری میں سیاست کو ابھارا اور سیاسی عناصر کو جامہ شعر پہنایا اور کامیاب رہے۔ فیض بھی اسی دبستان کا ایک فرد ہے جس کی شاعری، شعریت، بہاؤ، رنگین لہجہ، لطیف و خوشگوار احساسات، دائمی اثر، مدہم جذبات و منطقی استدلال کا کامیاب امتزاج ملتا ہے۔ شعریت و سیاست کے شیریں امتزاج کی شاندار عکاسی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" میں نمایاں ہے۔

مگر غیر مساوی سماجی تقسیم اور ناجائز دباؤ میں تڑپا جاتا ہے کہ

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جسمیں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

فیض کسی خاص مرکزی خیال کا شاعر نہیں وہ کبھی خاص پیغام یا فلسفہ کا پرچار نہیں کرتا۔ اس کی شاعری سوسائٹی کے خاکے میں مدغم و جلوہ فرما ہے اور اس کی شاعری ہی اس کی شخصیت کی عکاسی ہے اور یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ فیض زندگی کا شاعر ہے۔ فیض ترقی پسند تحریک کا ایک ممتاز رکن ہے۔ خود ضبطی اور انتہاپسندی سے گریز برتتے ہوئے ہر چیز کو اعتدال میں پیش کرتے ہیں۔ بہر حال فیض کی شاعری تصور پرستی اور حقیقت نگاری کا حسین سنگم ہے جیسے کہ قوس قزح۔ آپ کی شاعری میں ہلکی سی بیداری، مدہم جذبات کی فراوانی اور انقلاب کی تاثیر دوڑتی ہے۔ تسلسل، ربط، احساس کی نزاکت اور خوابیدہ حزن کلام فیض کا حصہ ہیں اور وہ دنیا کی ہر چیز سے قطع نظر، شاعری کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

فیض ہوتا رہے جو ہوتا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

فیض کی غزلیں بھی پیچیدگی اور الجھاؤ سے مبرا ہیں اور مدہم سوز بھی جلوہ فرما ہے کہ

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

فیض کہتا ہے کہ

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے۔

"رہگزر" قافیہ اور "میں ہے" ردیف فیض کے ہاں یوں ہے کہ

سیکھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی
رب کریم ہے تو تری رہگزر میں ہے

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنج لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سر کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضور یار ہوئی دفتر جنوں کا طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت، مری محبوب نہ مانگ!

مخدوم محی الدین

(1908ء-1969ء)

پورا نام :	ابو سعید محمد مخدوم محی الدین خدری
تخلص :	مخدوم
پیدائش :	1908ء حیدر آباد دکن
تعلیم :	ایم-اے اردو
شعبہ ملازمت :	درس وتدریس
آغاز شاعری :	1933ء
نقطہ نظر :	اشتراکی/کمیونزم
بانی تحریک :	1936ء میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی-
وفات :	3جون1969ء
نثری تصانیف :	(ڈرامے) "ہوش کے ناخن"، "مرشد کامل" بہت مقبول ہوئے-
شعری مجموعے	سرخ سویرا، گل تر، بساط رقص
اعزاز :	رسالہ "صبانے" 1966ء مخدوم نمبر شائع کیا-

شاعری کی خصوصیات

ترقی پسند شعراء کی تحریک سے وابستہ ہونے کی بدولت اکثر شعراء نے پہلے رومانی شاعری کی اور بعد میں سیاسی و سماجی انقلاب لانے کے لیے بھرپور جوشیلے اشعار لکھے کہ جذبات عوام بیدار ہو سکیں- یہی کیفیت مخدوم کی شاعری میں واضح نظر آتی ہے کہ ان کی غزلوں میں رومان اور انقلاب دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں جو والہانہ پن ان کی نظموں کی جان ہے وہی اثر کم و بیش ان کی غزلوں میں بھی ہے اور غزلیں انقلاب کی سلگتی ہوئی چنگاری کی مانند ہیں جس میں

مخدوم نے آواز انقلاب کو روح میں سمونا چاہا ہے- مخدوم ایک مخصوص لہجہ اور طرز کے موجد ہیں- ان کا غزلیہ اسلوب عوامی اسلوب ہے اور شعری خصوصیات میں خلوص، صداقت اور خود اعتمادی کا جذبہ بھی کار فرما ہے- مخدوم محض زبان و محاورہ کا ہی شاعر نہیں بلکہ ان کے ہاں عصری آگہی، ادراک پختہ شعور کے ساتھ لہجے کی نرمی اور ٹھنڈک ہے- مخدوم مارکسی نظریات پر پختہ ایمان رکھتے تھے وہ ایک سچے اور کھرے کمیونسٹ تھے اس لئے ان کی زندگی ایک سیاسی کارکن اور رہنما کی حیثیت سے بسر ہوئی- مخدوم شاعر ہونے کے ناطے معاشرے کی ظالم قوتوں سے مسلسل ٹکراتے رہے اور ایسے جہاں کی تعمیر کا خواب بنتے رہے جہاں نابرابری، ظلم و جبر، استحصال کی بجائے اخوت و محبت کی فضا ہو اور ہر کوئی چین کی بانسری بجائے- کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار ان کی نظم "جہان نو" میں ملتا ہے جہاں وہ عام آدمی کو پیام دیتے ہیں کہ

ایسا جہاں جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

مخدوم کو آس پاس کی دنیا سے اس لئے بیر ہے کہ سفاک سماج کا رویہ مظلوموں اور کمزوروں کے ساتھ ظالمانہ ہے اور وہ افلاس و غلامی کے دل دوز مناظر سے لرز اٹھتے ہیں جیسا کہ نظم "قمر" میں گویا ہیں-

یہ کس غریب کے سینے میں ہوک اٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل تھرتھرا رہا ہے قمر
اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

دیگر اقوام عالم کی طرح دوسری جنگ عظیم میں جب ہندوستان کے مزدور، کسان اور مفلس عوام غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو مخدوم نے بھی آزادی وطن کا

نعرہ بلند کیا۔

قسم ہے خون کے سینچے ہوئے رنگین گلستاں کی
قسم ہے خون دہقاں کی قسم خون شہیداں کی
زمین پاک ان ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

مخدوم نے اپنی رومان پرور شاعری کا بھی لوہا منوایا ہے۔ دراصل یہ رومان پروری کالج کی رنگین فضا کی مرہون منت ہے۔ رومانیت کا فکری انداز، تقاضہ شباب، ٹیگور اور ورڈز ورتھ سے لگاؤ کا نتیجہ تھا پھر جب ہندوستان کی سیاسی جدوجہد نے بغاوت کی راہ اختیار کی تو رومان مخدوم انقلاب سے بدلا۔ چنانچہ نظم "باغی" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ غزلوں کے رومانی اشعار مثلاً مخدوم کا غزلیہ انداز ناامیدی ومایوسی نہیں بلکہ زندگی کی امنگ واضطراب فطرت انساں ہے جسے کسی لمحے قرار نہیں۔ لہجہ صوت سبک ونرم ہے مثلاً

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے

مخدوم کی غزلوں کی نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی غزلوں میں زندگی گنگناتی، ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے۔ ان میں جذبات کی صداقت اور خلوص نیت کار چاؤ ہے۔ غزلیات مخدوم تازہ نیاز کی کیفیات ابھارنے کی بجائے جرات مندانہ کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ یہ انسان کو جوش عمل، فکر و نظر اور بلندی کردار کا پیام دیتی ہیں۔ اس لئے یہ ساکن وجامد نہیں بلکہ متحرک ہیں کہ انہوں نے غزل کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ یہاں داخلی محرکات وسیاسی علامتوں کی بھی فراوانی ہے کہ

تحفہ برگ گل و باد بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

مخدوم کا ترقی پسند شعراء میں ایک اہم مقام ہے اس لئے ان کا نام فیض، جعفری کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مخدوم کا چھپا کرب علامتوں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے گو فکر خاص مخدوم کے مزاج کے خلاف ہے اس لئے یہ جز وغزل نہیں بن سکا۔ بہرحال وہ جذبے کو احساس کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے ہاں جذبے کی شدت وخلش کارفرما ہے۔
ان کی شخصیت کے دو پہلو تھے۔ ایک سیاسی پہلو اور دوسرے تخلیقی حیثیت باقی رہی)۔ ترقی پسند شعراء میں مخدوم کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کا نام فیض، مجاز، جعفری کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مجاز کے ہاں زندگی کا نشاطیہ رنگ ہے۔ مخدوم کے لہجہ میں تحت نغمہ کی کیفیت ہے۔) اس اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں فیض سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ مخدوم بحیثیت شاعر معاشرے کی ظالم قوتوں سے متصادم رہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے دل میں چھپے ہوئے کرب واضطراب کو علامتوں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ ان کا مزاج مفکرانہ نہ تھا۔ اس لئے فکر ان کی غزلوں کا جز نہ بن سکی۔ وہ غزل میں احساس اور جذبے کے شاعر ہیں۔ مخدوم کی غزل ترقی پسند غزل کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی غزل قدیم غزل کی توسیع ہے، ان کی غزلوں میں احساس کی شدت، خلش اور تشکیک ہے۔ مخدوم غزل گوئی کا ایک انداز یہ بھی ہے مثلاً

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی
زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو
کیسے طے ہوگی یہ منزل شام غم
کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم

مخدوم نے اگرچہ غزلیں کم کہیں ہیں لیکن ان کی غزلوں میں جذبات واحساسات میں ان کی غزلوں میں آدرش کا حسن، مستقبل کے خوابوں کا نور ہے جسے انہوں نے اپنی شخصیت کے پورے رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں احساس کی شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ سیاسی اور نظریاتی نقطہ نظر سے مخدوم، جعفری، مجاز، ساحر، ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں لیکن ان شعراء نے سیاسی مسلک اختیار کرنے کے باوجود ادب کے دامن کو ہاتھ سے

جانے نہیں دیا۔ تاہم فن کا وہ بلند پایہ مقام ان شعراء کو نہیں مل سکا جو اصغر، فانی، حسرت، جگر کے بعد جوش اور فیض کو حاصل ہو سکا۔

شاعری مخدوم کی غزلوں میں رومان اور انقلاب دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں جو والہانہ کیفیت ان کی نظموں میں ہے، وہی ان کی غزلوں میں ہے۔ ان کی غزلوں میں انقلاب کی سلگتی ہوئی چنگاری ہے۔ انہوں نے انقلاب کی آواز کو اپنی روح میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مخدوم کا ایک مخصوص لہجہ ہے۔ انہوں نے غزل کو عوامی اسلوب دیا۔ ان کی غزلوں میں خلوص، صداقت اور خود اعتمادی ہے۔ مخدوم کی غزلوں میں زبان اور محاورے کی شاعری نہیں بلکہ ان کی غزلوں میں عصری آگہی کے ساتھ لہجے کی نرمی اور ٹھنڈک ہے۔

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور، اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

پیار، حرفِ وفا
پیار، ان کا خدا
پیار ان کی چتا

اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو، تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی چمن کی سبک رو ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی
ہم نے دیکھا نہیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا نہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا نہیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا نہیں
از ازل
تا ابد!

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخہ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور، اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
چارہ گر!

مخدوم

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مناجاتیں نہ تھیں

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں، ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

اخترالایمان

(1915ء تاحال)

نام : محمد اختر انجم
پیدائش : 1915ء، ضلع سہارنپور
تعلیم : بی۔اے، علی گڑھ
مجموعہ کلام : "گرداب" 1941ء "تاریک سیارہ" "یادیں" 1961ء

شاعری کی خصوصیات

اخترالایمان ترقی پسند شعراء میں نمائندہ شاعر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ترقی پسند تحریک کو کھل کر نہیں اپنایا تاہم ان کی غزلیں جدیدیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں انفرادیت ہے لیکن ان کی غزلوں میں اس حد تک فکری عنصر اور رچاؤ نہیں جو فیض اور جذبی کے ہاں ہے۔ ان کے اسلوب میں ندرت اور غزلوں میں تجربے کا آہنگ ہے۔ رومان کی بہ نسبت ان کا سیاسی احساس زیادہ بیدار نہیں ہے۔ اختر نوجوان احساسات کے شاعر ہیں۔ ترقی پسند شاعری میں [illegible] ایک نئے لہجے کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں چٹیلا پن ہے جو گردشِ حالات سے گزر کر آنے کا نتیجہ ہے۔ ان کی غزلیں یاس و ناامیدی کے درمیان کشمکش کی غمازی کرتی ہیں۔ مثلاً

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

پھر غزل خوانی کرو

مدتیں گزریں زمانہ ہو گیا
یار کو مہماں کرو
راحت جاں کا کوئی ساماں کرو
رسم دلداری نبھانے کا یہی موسم تو ہے
جب خزاں دیدہ بہاریں پھر پلٹ کر آئیں گی
جب پرانے گھاؤ سب
مندمل ہو جائیں گے
جیسے بے معنی شرارت تھی ہوا جو کچھ نہ تھا
ہم سے گر پوچھو تو سچ کچھ بھی نہیں
اس کی آنکھوں کے تبسم کے سوا
خواب گر، عیسیٰ نفس کے اک تکلم کے سوا
جسم کے بے ساختہ دھیمے ترنم کے سوا
آبلوں پر اپنا نشتر جب رکھے جراح وقت
مضمحل اعصاب میں بجلی سی دوڑانے لگے
تب کہو جینے کا امکاں ہو گیا
عظمت انساں یہی تو ہے چھپا لے زخم سب
خون سے تر ہو جو دامن گل بدامانی کہے
آرزو کی جلوہ سامانی کہے
گوہر افشانی کہے دشنام کو
ہر خلش کو مایہ جانی کہے
خواہش راحت مرض ہے اس کا درماں چاہئے۔

خود کو بہلاؤ کہ بس اگلے برس اگلے برس
رسم غم خواری نبھانے کا یہی موسم تو ہے
دل کو سمجھاؤ کہ بس اگلے برس اگلے برس
مکتب غم اس لیے ہی تو کھلا ہے سیکھ لیں
کس نہاں خانے میں رکھیں وہ ہزیمت خوردگی
جس کو لافانی کہیں
روح فرسا اب کوئی منظر نہیں
عظمت انساں یہی تو ہے دہان زخم کو
گل بنا کر پیش کر دے ہر نمائش گاہ میں
کوئی موسم ہو غزل خوانی ہمارا شیوہ اجداد ہے
پھر غزل خوانی کرو
ہے تاسف چارہ گر کو اب ہمارے حال پر
اب اسے بھی چارہ سازی آ گئی
دل نوازی آ گئی
وہ علی گڑھ ہو کہ لندن، شہر سب یکساں ہیں آج
بالادستو اپنے بے پایاں کرم کی پھر فراوانی کرو
ہے پھر اس معمورے میں قحط غم الفت بہت
دوستو کو پھر ہوا پھر غم کی ارزانی کرو
پھر غزل خوانی کرو
مدتیں گزریں زمانہ ہو گیا

اختر الایمان

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اختر بہت ہی خوبصورت شاعرانہ انداز میں چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور وہ اپنے تاثر سے ہمیشہ ذہن کے افق پر بازگشت کی طرح ٹکراتی ہیں۔

ن-م راشد

(1910ء تا 1975ء)

نام : نذر محمد
قلمی نام : راشد
مادری زبان : پنجابی
ولادت : گوجرانوالہ، 1910ء
وفات : 10 اکتوبر 1975ء
تعلیم : ایم اے- اقتصادیات یونیورسٹی پنجاب
ملازمت : 1952 UNO میں بحیثیت انفرمیشن آفیسر، آل انڈیا ریڈیو میں بھی ملازمت کی۔
شعری مجموعے : "ماورا" 1942ء ایران میں "اجنبی" 1955ء- "لاانسان" 1966ء

شاعری کی خصوصیات

راشد علم بغاوت لے کر روایتی اردو شاعری کے میدان میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انہوں نے یکسر مروجہ فنی سانچہ بدلا، موضوع وہیئت شعر میں نئے تجربات کئے۔ راشد نے سائیٹ، نظم نیم آزاد اور آزاد نظم کی صورت ان تجربات کو اردو شاعری کے دامن میں سمویا۔ غزل کے ذریعے بھی نیا ادراک وشعور شامل کر کے اس کی وسعت کو بڑھایا ہے۔ راشد کا بطور خاص کارزار میدان نظم آزاد ہے۔ راشد بہت سے نقادوں کے نزدیک اردو میں آزاد نظم کے گنے چنے ہنرمند شاعروں میں سے ہیں جنہیں یہ ملکہ حاصل ہے۔

راشد کی شاعری میں سماجی کرب ہے جو ماحول وسماج کی عدم موافقت سے الجھنوں کو پیدا کرتا

ہے اور ان نفسیاتی الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ وہ زندگی کی الجھنوں سے نبرد آزما ہونے کی بجائے اپنے آپ کو لاچار، کوتاہ ہمت اور بے بس پاتے ہیں۔ نظم "اجنبی عورت" میں یہ بے بسی دیکھیے۔

ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

"راشد کی شاعری کا شخص ایک تھکا ہوا اور شکست خوردہ ذہن کا شخص ہے وہ ناامیدی، ٹھہراؤ، جمود شکستہ مذہبی اعتقاد کا شکار ہے جسے اپنی قوت بازو پر بھروسہ نہیں اس لئے قدم قدم پر کلام راشد نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ شکستہ ایمانی، بے اعتباری و بے یقینی کی کیفیت نظم "رقص" میں نظر آتی ہے"۔

راشد جبری و استحصالی قوتوں کے خلاف ہیں۔ اس کے ساتھ تسلط مغرب سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مکمل آزادی انساں چاہتے ہیں جہاں گھٹن نہ ہو، مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش نہ ہو۔ اس گھٹن زدہ ماحول کو راشد نے علامتی انداز میں ظاہر کیا ہے۔ شعور و تحت الشعور کی کیفیت بھی ابھرتی ہے اور ساتھ ہی جنسی ادراک بھی، تو اس کے پس منظر میں فرائڈ کی شخصیت چھپی ہے۔ علامتی انداز میں خوبصورت کہی جانے والی نظم "اسرافیل کی موت" ہے۔ راشد کے کلام سے ابہام پرستی بھی عیاں ہے۔ اس پر اسراریت کے لئے وہ نئے نئے لفظوں، تراکیب، استعارات، تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں۔ اصل مطلب تک قاری کافی غور و فکر اور تدبر کے بعد ہی پہنچ پاتا ہے۔ ایمائیت و اشاریت پسندی بھی ایک نمایاں خوبی ہے۔ ذاتی نشاط و کرب اور تحلیل نفسیات کی بدولت راشد کا رشتہ قاری و سامع سے عمومی کی بجائے خاص ہو تا جاتا ہے کہ قاری کو آغاز غزل و نظم سے اپنے ساتھ ساتھ لئے چلتے ہیں کہ

یہ زخم ایسے ہیں جو اشک ریا سے سل نہیں سکتے
کسی سوچے ہوئے حرف وفا سے سل نہیں سکتے

راشد کے ہاں منفیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہ منفی رجحان ان کے ہاں مذہب و ادب دونوں میں پایا جاتا ہے۔ راشد آزاد قلب و ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے کسی جبر و پابندی کے قائل نہیں اور مسلسل حقائق زندگی سے انکار کرتے رہے کہ مساوی رویہ ہی معراج انساں ہے ورنہ عالم آب و گل، تخلیق آدم سرے سے ہی بے معنی ہیں۔
اگر مختصراً کلام راشد کے اوصاف کو جانچا جائے تو چند ایک اوصاف نظر آتے ہیں کہ ان کے ہاں شکست خوردگی، احساس کمتری، سرابہام، علامتی انداز، اشاریت پسندی، ایمائیت، تحلیل نفسی، منفیت، جنسی، ادراک وغیرہ ہیں۔

میں اسے واقف الفت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اس کی اسیر غم الفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں، وقف مصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقف درد نہیں، خوگر آلام نہیں
سحر عیش میں اس کی اثر شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں!

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا

سوچتا ہوں کہ غم دل نہ سناؤں اس کو
سامنے اس کے کبھی راز کو عریاں نہ کروں
خلش دل سے اسے دست و گریباں نہ کروں
اس کے جذبات کو میں شعلہ بداماں نہ کروں

سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی
خود تو وہ آتش جذبات میں جل جائے گی

اور دنیا کو اس انجام پہ تڑپائے گی

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ معصوم ہے وہ
-- میں اسے واقف الفت نہ کروں

ن-م راشد

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں!
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں،
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لیے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں؟
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لحظہ لحظہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں

تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لیے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

ن - م راشد

جوش ملیح آبادی

(1896-1982)

نام : شبیر حسن خاں
قلمی نام : جوش - شاعر انقلاب
ولادت : 25 دسمبر 1896ء ملیح آباد
وفات : 1982ء
ابتدائی تعلیم : سیتاپور لکھنؤ
ملازمت : 1 - جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ہندوستان - 2 - نگرانی اردو لغت ترقی اردو بورڈ پاکستان -
شعری مجموعے : پہلا مجموعہ "روح ادب" - "شعلہ شبنم" - "نقش نگار" - "فکر نشاط" - "جنون و حکمت" - "شاعر کی راتیں" -
نثری مجموعہ : "یادوں کی برات"
اعزاز : سورہ رحمان کا منظوم ترجمہ کیا -

جوش کی شعری خصوصیات

جوش نے جس جاگیردارانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہے وہاں غزل کا رواج تھا - اس لئے جوش نے شروع میں روائتی غزل گوئی کی - جوش فطری طور پر رومانی شاعر ہیں لیکن وہ اپنے عصری رجحانات اور تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں رہے - جذبے کو ان کے ہاں تقدم حاصل ہے - فکر ثانوی حیثیت رکھتی ہے - ان کے لہجے میں ناآسودگی کی گھن گرج تھی - وہ منظر نگاری اور محاکات کے بادشاہ ہیں - آبائی عقائد اور پارینہ روایات سے ناآسودگی جوش کے ہاں مذہب سے بغاوت کی شکل میں نمودار ہوئی - روائتی غزل کی تنگ دامانی کے احساس نے ان کو غزل سے نفرت کرنا سکھائی - وہ غزل کو ناقص صنف سخن سمجھتے تھے - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا مزاج غزل کے بجائے نظم سے زیادہ قریب تھا مگر شروع میں انہوں نے غزل ہی کا

سہارا لیا - 9 سال کی عمر میں انہوں نے پہلا شعر جو کہا یہ ہے -

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ میرا فن خاندانی ہے

روح ادب اس وقت کا کلام ہے جب جوش جواں ہو رہے تھے - یہ جوش کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے - روح ادب میں نو برس سے لے کر بیس برس تک کا کلام ہے - اس کے بعد کا کلام شعلہ و شبنم میں ہے - قدیم رنگ تغزل کے بعد جوش کے ہاں غزل مسلسل ملتی ہے - جوش کی غزل مسلسل کے نمونے دیکھیے :-

لو کھل گیا وہ پرچم خورشید زرنگار
اٹھو کہ وا دریچہ صد رنگ و بو کریں

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکر خوباں کی نہ ہو
خاک ہونا ہے تو خاک کوئے جاناں کیوں نہ ہو

ہاں اس طرف بھی عابد شب زندہ دار دیکھ
ایمان ڈھل نہ جائے گا صرف ایک بار دیکھ

نہ جانے رات کو تھا کون زینت پہلو
مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو

ہنوز شعلہ سے پردے میں منہ چھپائے ہوئے
مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں بے جلائے ہوئے

سرشار ہوں سرشار ہے دنیا میرے آگے
کونین ہے اک لرزش صہبا مرے آگے

جوش

شکستِ زنداں کا خواب

کیوں ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شائد کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیوار کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جوش

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا
محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے کلی! ناز سے کھل، بادہ سر جوشِ اہل
کہ نگاہ چمن و شاہدِ مستاں آیا
خاطر جمع سے ہوشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشتیٔ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا
نگاہ مہر سے اے آفتاب عالم پاک
حقیر خاک کے ذروں کو جگمگاتا جا
ملا کے مجھ سے نظر عزتِ جنوں کی قسم
چراغ محفل عقل و خرد جلاتا جا

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی، تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد

اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا، مجھ سے کچھ ارشاد کیا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
یہی تو ہیں دوستو محکم، انہیں پہ قائم ہے نظم عالم
یہی ہے راز خلد و آدم، نگاہ میری شباب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیم دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا
کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہیگی دونوں کو کرکے رسوا
یہ شورش ذوق دید میری یہ اہتمام حجاب تیرا

جوش

جان نثار اختر

(1914ء-1977ء)

نام : جان نثار
قلمی نام : اختر
ولادت : گوالیار 1914ء
وفات : 1977ء
تعلیم : بی اے - علی گڑھ، ایم اے اردو 1939ء
ملازمت : لیکچرار
اعزاز : فلمی دنیا کے لیے گانے لکھے - ایڈیٹر علی گڑھ میگزین - سیکرٹری انجمن اردو معلیٰ -
شعری مجموعے : (1) سلاسل - (2) حرف آشنا - (3) جاوداں -

شاعری کی خصوصیات

جان نثار اختر صحبت ہمعصراں کے تحت اشتراکی فکر سے متاثر ہوئے - جان نثار اختر علی گڑھ فضائے دلبراں میں رومان کی وادیوں میں جا اترے کیونکہ وہ بھی ایک محب ہیں آغاز غزل ان کی محبت کی ابتدا ہی ہے یعنی

ستارے، دھنک، چاند، ابر، پھول
نظر تجھ پہ ٹھہری ہزاروں کے بعد

جان نثار اختر بھی دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح رومانیت سے انقلاب کی طرف گامزن ہوئے - وہ کسی ایسے انقلاب کے متلاشی نہیں جو آزادی، مساوات، نئے انداز فکر ونظام کی تشکیل

کر سکے - جان نثار اختر کو کوئی ایسا انقلاب چاہتے ہیں جو مار دے یا پھر مر جائیں - وہ خونیں انقلاب کی آواز بلند کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اقدار و روایات کا بدل جانا کوئی معنی نہیں رکھتا - وہ ایسا جوش اور ولولہ چاہتے ہیں جس سے زنجیر عالم ہی نیست و نابود ہو جائے -

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمین مجھ کو میرے خون سے تر لگتی ہے
فرق کچھ بھی نظر آتا نہیں زندانوں میں
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

ان کے نزدیک اگر جابر و قہار کو نہ روکا جائے تو ظلم و ستم نت نئی شکلوں میں پنپتا ہی رہتا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ شب و روز جاری و ساری رہتا ہے اور رہا ہے - اس لئے وہ خونیں انقلاب کے آرزومند ہیں -

جان نثار اختر کی ابتدائی شاعری میں تقلید و بیرونی کا عنصر نمایاں ہے - یہ تقلید روایتی عشقیہ اثرات کی حامل ہے اور ہر عاشق بے تاب نے اپنی دلی کیفیات و احساسات کی ترجمانی رومانی طرز پر کی ہے - گو جان نثار اختر یہ گوارا نہیں کرتے کہ انہیں رومانی و روایتی شعراء کی صنف میں کھڑا کیا جائے لیکن کلام میں رومانیت کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ

کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے
تیری یادوں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے
دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک تیرے گلشن کو سجا رکھا ہے

جان نثار اختر نے حقیقت اور رومان کے ملاپ سے اپنے لئے ایک نئی روشن راہ کا انتخاب کیا کہ ان کی غزلیں جدیدیت، تازگی و قدرت کی ترجمان بن گئیں اس نے شعور غزل نے ان میں خوبیاں بھی پیدا کیں جو انہیں افق شعر و سخن میں آپ اپنا مقام دائمی بنانے میں مددگار

ثابت ہوئیں یعنی غزل تغزل کے معیار پر پورا اترتی ہے کہ کڑوے و تلخ حقائق زندگی کو جامہ شعر پہناتے ہوئے سبک روی و ترقی اپناتے ہیں اور نازک احساس کو نازک آبگینہ الفاظ میں پروئے ہیں شاید یہ تاثر و احساس دل آویز حقیقت بن کر قاری پر اثر کرتا ہے - جان نثار اختر کی شاعری ماحول اور عصر حاضر کی عکاس بھی ہیں کہ انہوں نے بے کس و لاچار انسانیت کے مسئلوں کو گہری نگاہ سے جانچا اور غربت و افلاس، بھوک و فاقہ مستی اور جذبات شدید کا اظہار ایک مجبور محض کی طرح کیا ہے کہ وہ ایک قلاش و گداگر کی طرح بھیک مانگ کر ہی ضروریات زندگی پوری کرنے پر مجبور رہے - گویا کہتے ہیں کہ

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارہ ہی نہ ہو

زندگی کی مہم کو سر کرتے ہوئے اہل حال سے دریافت کرتے ہیں کہ

تم پہ کیا بیت گئی کچھ تو بتاؤ یارو

جان نثار اختر کے کلام سے ایک اور راز بھی کھلتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے حصار میں قید نہیں - وہ مساوات انسانی کے علمبردار ہیں اور عام اوصاف اخلاق کی تلقین و تاکید کرتے ہیں جو معراج انسانیت ہیں اور انسان کو درس دیتی ہے کہ وہ آقا و غلام، امیر و غریب، دوست و دشمن اور محبوب و رقیب جیسے بندھنوں میں الجھ کر اپنی معراج کو کھو نہ دے بلکہ ہر حال میں وقار و احترام انسان بحال رہے کہ

حدود ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر نہ کوئی رقیب لگتا ہے

دوسرے انسانوں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ

غم میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

کلام نثار میں دھیماپن، یقین واعتماد اور وفورِ جذبات، رومان کا جابجا اظہار موجود ہے۔

اب جاں نثار کی منتخب غزلوں کے اشعار :۔

پہلو میں میرے دیکھ وہی دل ہے آج بھی
روشن اسی چراغ سے محفل ہے آج بھی

زندگی شعلہ بہ جاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
قلب گیتی بھی تپاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارہ ہی نہ ہو

دیکھ جا کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

تم پہ کیا بیت گئی کچھ تو بتاؤ یارو
میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

نثار

احمد فراز

(1931ء تاحال)

نام : احمد فراز
تخلص : فراز
پیدائش : 12 دسمبر1931ء نوشہرہ
تعلیم : ایم۔اے اردو ایم۔اے فارسی
ملازمت : کچھ عرصہ ریڈیو میں ملازمت کی پھر پشاور یونیورسٹی میں بطور معلم مقرر ہوئے پھر پاکستان نیشنل سینٹر اسلام میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شعری مجموعے :
"درد آشوب"، "تنہا تنہا"، "نایافت"، "جاناں جاناں"، "میرے خواب ریزہ ریزہ"، "نابینا شہر میں آئینہ"، "بے آواز گلی کوچوں میں"، "پس انداز غم"، اثاثہ (کلیات)

شاعری کی خصوصیات

فراز کو اپنے باکمال شاعر ہونے کا احساس خود بھی ہے کہ ان کا ہر ہر شعر زبان زد خاص وعام ہے۔ فراز نئی نسل کے مقبول ترین اور نمائندہ شاعر ہیں۔ فراز اپنے حساس نقطہ نظر کو خلوص کی چادر اوڑھا کر صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ احمد فراز کی شاعری پر فراق گورکھپوری کی رائے ملاحظہ ہو جو "درد آشوب" میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز نہایت حساس اور پر خلوص ہے۔ ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانوی شاعری نہیں کہا جا سکتا بلکہ دور حاضر کے لطیف ذہنی رد عمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ان کا کلام اردو شاعری کے نئے موڑ کے کئی نازک زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے"۔

فراز اپنے آپ کو عجیب شاعر کہتے ہیں کہ

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر

احمد فراز کی شاعری ایک باشعور حساس شاعر کے جذبات عمیق کا پرتو واظہار ہے کہ درد جہاں کو ایک مخلص انسان ہوتے ہوئے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ فراز کا حساس ہونا ہی ان کے آغاز شعری کی بنیاد ہے۔ بھائی کے لئے عمدہ کوالٹی کا کپڑا لائے جانے پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے کہ میرے (فراز) کے لیے معمولی کپڑا خریدا گیا ہے جو کہ سستا ہے۔ یہ امتیاز و فرق بھلا حساس فراز سے کب برداشت ہوتا تھا چنانچہ کہا کہ

جبکہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

گردش ایام نے اس حساسیت کو مزید صیقل کیا۔ نت نئے طبقاتی تضادات و امتیازات نے شعلہ جوالا کا روپ دھار کر ذہن انسان کے حساس جذبات کو بیدار کیا۔ ان لسانی و گروہی تعصبات کی چکی میں جب مظلوم و بے کس عوام کو پیسا جاتا ہے ان کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں تو ایک حساس دل و دماغ اور فکر مخصوص رکھنے والا بھلا کب خاموش رہ سکتا ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر اپنی قوت گویائی کے متعلق رقم کرتا ہے کہ

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

فراز بنیادی طور پر غزل گو ہیں اور روایت ادب اردو کی کلاسکیت کے امین ہیں کہ مضامین شاعری حسن و عشق سے متعلق ہیں۔ غزلیات فراز عصری و ماحولیاتی تقاضوں سے مزین ہیں۔ فراز ایک ماہر نفسیات کی طرح زخم خوردہ اور ستم زدہ انسانیت کی مجبوریوں کو جانچ پرکھ کر عظمت انساں کا درس اپنی شاعری میں پیغام کی صورت میں دیتے ہیں کہ کرب تنہائی میں بھی

واپسی

اس نے کہا
سن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مجبوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈوبو
جس دل میں بھی اترو
میری طلب آواز نہ دے گی
لیکن جب میری چاہت
اور میری خواہش کی لو
اتنی تیز اور اتنی
اونچی ہو جائے
جب دل رو دے
تب لوٹ آنا

احمد فراز

احمد ندیم قاسمی

(شاعر۔افسانہ نگار۔جرنلسٹ۔نقاد)

نام :	احمد ندیم
قلمی نام :	قاسمی
مادری زبان :	پنجابی
ولادت :	20نومبر1914ء انگہ سرگودھا پاکستان
تعلیم :	بی۔اے
اعزازات :	ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب1952ء جنرل سیکرٹری۔ایڈیٹر۔اخبار
ادارت :	فنون۔ادب لطیف۔نقوش۔سویرا 1954ء حکومت پاکستان نے انہیں بغاوت کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرلیا۔
شعری مجموعے .	"دھڑکنیں"۔"رم جھم"۔"جلال جمال"۔"شعلہ گل"۔ "دشت وفا"۔"محیط"۔"دوام"۔

شاعری کی خصوصیات

حقیقت پسند شاعر ہیں۔ان میں انسانیت کی عظمت کا احساس موجود ہے۔ندیم نے جاگیرداری نظام۔ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔وہ غلامی، مظلومیت اور رذلت کو برداشت نہیں کرسکتے۔انسانیت، محبت، امن و آشتی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں انفرادیت ہے۔البتہ ماحول، حالات اور سماجی اثرات ان کی غزلوں میں ہیں۔انہوں نے وزن، بحر، ردیف و قافیہ کے حدود میں رہ کر شاعری کی ہے۔ندیم کا اسلوب سیدھا سادہ اور انداز بیان سلیس ہے۔ان کی قوت متخیلہ میں گہرائی ہے۔آگے احمد ندیم قاسمی کی منتخب کردہ نظمیں ملاحظہ کیجئے

پتھر

ریت سے بت نہ بنا، اے مرے اچھے فنکار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لادوں
میں ترے سامنے انبار لگادوں۔۔۔۔ لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا؟
سرخ پتھر؟ جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیر کے پڑے ہوں ڈورے؟
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے
ایک وہ پتھر ہے، جسے کہتے ہیں تہذیب سفید
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے
ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے، مگر
ہاتھ میں تیشہ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہیں
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زبان پتھر ہے
ریت سے بت نہ بنا، اے مرے اچھے فنکار
جتنے معیار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام، ترا ذہن رسا بھی پتھر

احمد ندیم قاسمی

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں

مجھ سے کترا کے گزر جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بعنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں

زخم چھپ سکتے ہیں لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں

مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

احمد ندیم قاسمی

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

احمد ندیم قاسمی

علی سردار جعفری

(ممتاز شاعرونقاد)

نام : علی سردار جعفری
قلمی نام : جعفری
مادری زبان : اردو
ولادت : 1911
تعلیم : بی۔اے علی گڑھ
شعری مجموعے : "خون کی لکیر"۔"نئی دنیا کو سلام"۔
نثری مجموعے : "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب"، "پیراہن شرر"، "لہو پکارتا ہے"۔
تصنیف : "ترقی پسندی"۔"اقبال شناسی اور میر"۔"غالب اور کبیر"۔"پیغمبران سخن"۔
اعزازات : 1970ء پدم شری ایوارڈ (اردو شاعری کی ڈکشنری) سویٹ نہرو ایوارڈ۔ صدیقی ایوارڈ۔ علامہ اقبال کی شاعری اور فن کے بارے میں دو دستاویزی فلمیں تیار کی ہیں۔

جعفری اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے 1940ء میں گرفتار ہوئے۔ جعفری غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان نظموں میں سیاسی شعور ہے۔ جو ان پر مارکس اور لینن کا اثر ہے۔ مارکسی نظریات سے وہ بہت متاثر ہیں اس لیے وہ کھل کر مارکسی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "پرواز" ہے۔ جس کا دیباچہ مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے۔ مارکسی نظریات کو جعفری نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ جعفری کی نمایاں خصوصیت اظہار کی بے باکی اور احساسات کی صداقت ہے۔ وہ جوش کی طرح بہت صاف اور کھری باتیں کرتے ہیں۔ ان کے خیالات میں لگاؤ لپٹاؤ نہیں ہے جو کچھ ہے برملا ہے۔ کھل کر ہے۔

جعفری کی غزلیں روایتی انداز کی ہیں۔ ان میں ایک قسم کی لطافت اور شائستگی ہے۔ جعفری نے انسانی ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں رنگ و آہنگ ہے مگر وہ بات نہیں جو فیض و فراق کی غزلوں میں ہے۔ جعفری ترقی پسند شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ جدید شاعری میں ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ البتہ ان کے لہجے کی تابناکی نے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے لہجے میں رزمیہ انداز ہے جو جنگ پر ابھارتا ہے۔

جعفری کی غزل کا ذہنی افق زیادہ وسیع نہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے تنوع کا احساس کم ہے۔ اس ک سبب یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں فکر کی یکسانیت ہے۔ ان کی غزل کی سب سے بڑی کمزوری ان کا جذباتی لب ولہجہ ہے۔ سردار جعفری ان ترقی پسند شعراء میں ہیں جنہوں نے اس تحریک کا پیغام طالب علمی کے زمانے میں سنا۔ پھر اس پیغام کو نہ صرف شعوری طور پر قبول کیا بلکہ اپنی شناخت بھی اسی تحریک کے وسیلے سے کرائی۔ جعفری ترقی پسند تحریک کی سب سے مستحکم اور غیر متزلزل آواز ہیں۔ اس نظریے کی بازگشت ان کی غزلوں میں ہے۔ ان کی غزلوں کے چھ شعر ملاحظہ کیجئے۔

۵۔ حسن کی رنگین ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوتی گئیں
یاں میری بھٹکی ہوئی نظریں بھٹکتی ہی رہیں
۶۔ واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
ٹھہر تھرا سکتا ہے عارض پہ ٹپک سکتا نہیں
سکوں میسر ہو تو کیونکر ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظام دارورسن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمہ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے ساز کہن وہی ہے
فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ

امتحان بزم وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشین ہے اسے یزداں کہئے
سیکھئے ساپہ آہوں کے غزل خواں ہونا
جھلملاتے ہوئے اشکوں کو چراغاں کہئے

ادا جعفری

(1924ء تاحال)

نام : عنبریں جہاں بیگم
تخلص : ادا/ جعفری (شادی کے بعد)
ولادت : 1924ء اگست
تعلیم : انٹرنس 1940ء
خصوصی امتیاز : اردو، فارسی اور ہندی
مجموعہ کلام : "میں ساز ڈھونڈتی رہی" 1950ء - "شہر درد" 1967ء - "غزالاں تم تو واقف ہو" 1974ء - "ساز سخن بہانہ ہے"۔

شاعری کی خصوصیات

ادا صاحبہ نظم و غزل دونوں کہتی ہیں۔ نظموں میں انہوں نے پابند و آزاد ہر طرح کی نظمیں کہی ہیں مگر ہیئت کی تبدیلی کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ردیف و قافیہ کے حسن و ترنم کی قائل ہیں۔ آپ کو منظر نگاری اور رومان انگیز کیفیات کے اظہار پر بڑی قدرت حاصل ہے چنانچہ ان کی رومانی نظموں میں گو بیان تو وہی عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کا ہے مگر طرز ادا میں ایسا والہانہ پن، ترنم اور شگفتگی ہے کہ کہیں کہیں ان کی آواز پر اختر شیرانی مرحوم کی آواز کا اشتباہ ہونے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہی خصوصیات اس نغمہ ناہید کی جاذبیت و اثر آفرینی کی کافی سے زیادہ ضمانت ہیں۔ منظر نگاری کے سلسلے میں ادا صاحبہ نے نہایت رقصاں و نادر تشبیہات سے کام لے کر اپنے بیان کو موثر بنایا ہے۔ اس کے علاوہ مظاہر فطرت پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ اپنے دلدوز جذبات کو کچھ اس حسن لطافت کے ساتھ سموتی ہیں کہ ان کی منظریہ نظمیں محاکات کا ایک کارنامہ بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "جوہی کی کلیاں" "جھیل" "صبح بنارس" "بہار کا راگ" اور ایسی متعدد نظموں میں ادا نے جہاں فطرت کے لطیف مظاہر و مناظر کی تصویر کشی کی ہے وہاں اپنے ساز کے اس تار کو بھی چھیڑا ہے جس سے

غمگین نغمات پیدا ہوتے ہیں۔

ادا جعفری کا منتخب کلام

شکستِ ساز

میں نے گل ریز بہاروں کی تمنا کی تھی
مجھے افسردہ نگاہوں کے سوا کچھ نہ ملا
چند سہمی ہوئی آہوں کے سوا کچھ نہ ملا
جگمگاتے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی

میں نے موہوم امیدوں کی پناہیں ڈھونڈیں
شدتِ یاس میں مبہم سا اشارہ نہ ملا
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا نہ ملا
ہائے کس دشت بلاخیز میں راہیں ڈھونڈیں

اب فسوں ساز بہاروں سے مجھے کیا مطلب
آج ہیں میری نگاہوں میں وہ منظر توبہ
میں نے دیکھے ہیں لپکتے ہوئے نشتر توبہ
خلد بردوش نظاروں سے مجھے کیا مطلب

ادا جعفری

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی، برسرِالزام ہی آئے

حیران ہیں لب بستہ ہیں، دلگیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے

لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

تاروں سے سجا لیں گے رہ شہر تمنا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے

کیا راہ بدلنے کا گلہ ہم سفروں سے
جس رہ سے چلے تیرے در و بام ہی آئے

تھک ہار کے بیٹھے ہیں سر کوئے تمنا
کام آئے تو پھر جذبہ ناکام ہی آئے

باقی نہ رہے ساکھ ادا دشت جنوں کی
دل میں اگر اندیشہ انجام ہی آئے

ادا جعفری

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لو
سوچو تو آس پاس کوئی رازداں نہیں

کتنی ویران گزر گاہوں سے
سلسلے خواب کے ملتے ہوں گے
صبح زنداں میں بھی ہوتی ہوگی!
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

چاروں طرف تھی ریت، بہت تیز تھی ہوا
دل میں چھپا لیے ہیں تمہارے نقوش پا

یہ کیسا جبر ہے، حد نگاہ بھی تم ہو
نظر اٹھا کے جو دیکھوں نظر نہ آؤ مجھے

گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا
ہم آج خود سے ملے اور والہانہ ملے

ادا جعفری

کشور ناہید

(شاعرہ، صحافی، مترجم)

نام : کشور

قلمی نام : ناہید

ولادت : بلند شہر ہندوستان

شادی : یوسف کامران مرحوم - (دو بیٹے)

تعلیم : بی - اے پنجاب ایم اے معاشیات جو مکمل نہیں کیا -

ملازمت : ڈرایکٹر لاہور آرٹ کونسل - ایڈیٹر ماہ نو -

شعری مجموعے : "لب گویا" - "گلیاں دھوپ اور دروازے" (نثری نظمیں) "بانام صباحت" -

مقدمات : کشور ناہید پر تیس مقدمے فحاشی کے الزام میں بنائے گئے جن میں تمام مقدموں میں بری ہو گئی -

شاعری کی خصوصیات

عورتوں کے حقوق کی علمبردار، اردو شاعری کی پہلی باغی شاعرہ، کشور نے ایسے لکھا جس سے یہ پتہ ملتا ہے کہ وہ اپنی نسوانیت سے شرماتی نہیں ہیں - ناہید نے لب گویا کی غزلوں میں پہلی مرتبہ عورت کے جذبات واحساسات کی صحیح ترجمانی کی ہے - ترقی پسند شاعرہ اور ادیب ہیں اور انہوں نے ہر لمحے عورتوں کے حقوق ظلم - جبر کے جہاد کیا - ناہید نے ایشیا اور افریقہ کو زبان دی جو مردوں کے احتساب کا شکار تھیں اور ہیں -

وہ اجنبی تھا، غیر تھا کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاط غم دل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا

دست خیال یار سے پھوٹے شفق کے رنگ
نقش قدم بھی رنگ حنا کے سوا نہ تھا

کچھ اس قدر تھی گرمی بازار آرزو!
دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکر حبیب جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

کشور ناہید

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں
میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدوں میں نہ دینا صدا مجھے
وہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے
میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں
تمہاری یاد میں ہم جشن غم منائیں گے
کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

گریہ مایوسی غم ترک وفا کچھ نہ رہا
زندگی رہ گئی جینے کا مزہ کچھ نہ رہا
حسرت ہے کہ تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
میں تجھ سے مخاطب ہوں ترا حال بھی پوچھوں
تمام عمر یونہی کیجئے حسرتوں کا شمار
تمام عمر یونہی دکھ سنبھالتے رہیے

کشور ناہید

ہم گنہگار عورتیں

یہ ہم گنہگار عورتیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں

ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابت سرفراز ٹھہریں
وہ داور اہل ساز ٹھہریں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہر اک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں
جو بول سکتی تھیں، وہ زبانیں کٹی ملے ہیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا!

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں، نہ ہاتھ جوڑیں!

فہمیدہ ریاض

فہمیدہ ریاض

(1946ء - تاحال)

نام : فہمیدہ ریاض

ولادت : 28 جولائی 1946ء میرٹھ

مجموعہ کلام : "پتھر کی زبان" 1967ء - "بدن دریدہ" 1973ء "ادھورا آدمی" 1976ء - "دھوپ" - "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے" - "ہم رکاب" - "اپنا جرم ثابت ہے" - میں مٹی کی مورت ہوں" (کلیات)

فہمیدہ ریاض اردو نظم میں منفرد مقام رکھتی ہے - اس کی شاعری احساس بغاوت سے جنم لیتی ہے اور احتجاج بن کر شعری پیکر میں ڈھلتی ہے - وہ نسوانیت کی خود رحمی کا شکار نہیں ہوئی یا اس نے مرد کے معاشرے میں اپنی مظلومیت کا رونا نہیں رویا بلکہ احتجاج کے ذریعے سے اپنے وجود کو منوایا ہے - نسوانی ادب میں اس کی نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں - اس نے مختلف حوالوں سے نسوانی وجود کو بامعنی بنا کر مرد کے معاشرے میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے -

بشکریہ
ڈاکٹر محمد امین

پتھر کی زبان

اسی اکیلے پہاڑ پر تو مجھے ملا تھا
یہی بلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتھر مری وفا کا
اجاڑ، چٹیل، اداس، ویراں
مگر میں صدیوں سے، اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
پھٹی ہوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہوا کے وحشی بہاؤ پر اڑ رہا ہے دامن
سنبھالا لیتی ہوں پتھروں کو گلے لگا کر
نوکیلے پتھر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں اتنے گہرے اتر گئے ہیں
کہ میرے جیتے لہو سے سب آس پاس رنگین ہو گیا ہے
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
اور ایک اونچی اڑان والے پرندے کے ہاتھ
تجھ کو پیغام بھیجتی ہوں
تو آ کے دیکھے
تو کتنا خوش ہو
کہ سنگریزے تمام یاقوت بن گئے ہیں
دمک رہے ہیں
گلاب پتھر سے اگ رہا ہے!

فہمیدہ ریاض

یہ پیرہن جو مری روح کا اتر نہ سکا
تو نخ بنخ کہیں پیوست ریشہ دل تھا

مجھے مال سفر کا ملال کیوں کر ہو
کہ جب سفر ہی مرا قافلوں کا دھوکا تھا

میں جب فراق کی راتوں میں اسکے ساتھ رہی
وہ پھر وصال کے لمحوں میں کیوں اکیلا تھا

وہ واسطے کی طرح درمیاں بھی کیوں آئے
خدا کے ساتھ مرا جسم کیوں نہ ہو تنہا

سراب ہوں میں تری پیاس کیا بجھاؤں گی
اس اشتیاق سے تشنہ زباں قریب نہ لا

سراب ہوں کہ بدن کی یہی شہادت ہے
ہر ایک عضو میں بہتا ہے ریت کا دریا

جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دل میں ہے اس حرف رائیگاں پہ نہ جا

جسے میں توڑ چکی ہوں وہ روشنی کا طلسم
شعاع نور ازل کے سوا کچھ اور نہ تھا

فہمیدہ ریاض

پچھتاوا

خدائے ہر دو جہاں نے جب آدمی کو پہلے پہل سزا دی
بہشت سے جب اسے نکالا گیا
تو اس کو بخشا گیا یہ ساتھی
یہ ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ ہی آدمی کے قریں رہا ہے
تمام ادوار چھان ڈالو
روایتوں میں، حکایتوں میں
ازل سے تاریخ کہہ رہی ہے
کہ آدمی کی جبیں ہمیشہ ندامتوں سے عرق رہی ہے
وہ وقت جب سے کہ آدمی نے
خدا کی جنت میں شجر ممنوعہ چکھ لیا
اور سرکشی کی
تبھی سے اس پھل کا یہ کسیلا سا ذائقہ
آدمی کے کام و دہن میں ہر پھر کے آ رہا ہے
مگر ندامت کے تلخ سے ذائقے سے پہلے
گناہ کی بے پناہ لذت!

فہمیدہ ریاض

پروین فناسید

(1936ء تاحال)

نام :	فناسید
قلمی نام :	پروین
ولادت :	5 مئی 1936ء لاہور
تعلیم :	بی۔اے
مجموعہ کلام :	"حرف وفا" 1974ء۔ "تمنا کا دوسرا قدم" 1989ء۔ (یقین" 1992ء

پروین فناسید باشعور شاعرہ ہیں۔ ان کے موضوعات حقیقتوں کے احساس سے تراشے گئے ہیں اور یہ احساس شعری پیکروں میں ڈھلتا ہے۔ ان کی نظموں میں پیکروں کی فراوانی ہے۔ میں ان کی شاعری کو محض موضوعات کی شاعری نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ محسوسات کی شاعری ہے لیکن ان کا احساس بیدار اور باشعور ہے اگر ایک طرف ذاتی غموں اور ناکامیوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی غموں کو بھی اپنی خوبصورت گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ شاعری زندگی سے بیزاری کی شاعری نہیں بلکہ زندگی سے محبت کی شاعری اور حرف حق کی بے باکی کی شاعری ہے۔ ایک فقرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین فنا کی شاعری حرف حق کے شدید احساس کی شاعری ہے۔

بشکریہ
علی سردار جعفری

تو جسے زخم آشنائی دے
وہ تڑپتا ہوا دکھائی دے

تیری چاہت ہے جبر پیہم میں
کب سے زنجیر ہوں، رہائی دے

یا قریب آ رگ گلو کی طرح
یا پھر اس کرب سے رہائی دے

اس ہجوم بلا میں کوئی تو
آشتی کی کرن دکھائی دے

تیری آنکھوں کے آئینے میں مجھے
اپنی زخمی انا دکھائی دے

ہر طرف شور ہے کہاں سے کوئی
آشنا سی صدا سنائی دے

پروین فناسید

بظاہر یہ جو بیگانے بہت ہیں
ہمارے جانے پہچانے بہت ہیں

موت سے کھیلے ہیں ہم لیکن
غیر کی بندگی سے ڈرتے ہیں

کیا غضب تو نے اے بہار کیا
پتی پتی کو بے قرار کیا

اٹھیں تھیں آندھیاں جن کو بجھانے
وہ شمعیں اور بھڑکیں اس بہانے

تم کو سودائے محفل آرائی
اور ہمیں جستجوئے تنہائی

پروین فنا سید

پروین شاکر

(1952ء-1994ء)

نام : پروین
قلمی نام : شاکر-بینا
ولادت : 24نومبر1952ء
وفات : 26دسمبر1994کار کا حادثہ
تعلیم : ایم-اے انگریزی
ملازمت : لیکچرار انگریزی-ڈپٹی کلکٹر کسٹمز
اعزازات : یورپ اور امریکہ کے مشاعروں میں حصہ لیا-
شعری مجموعے : "خوشبو"1977-"صدبرگ"1980-"خودکلامی"1988-"انکار"1990-"ماہ تمام"(کلیات)1994ء-"بات شناسائی کی"1995ء

شاعری کی خصوصیات

پروین شاکر کے کلام میں جذبوں کی سچائیوں کے ساتھ پیدا ہونے والی لازمی شکست وریخت پر گریہ کی بجائے لطیف طنز کی عملداری ہے-انہوں نے خاص پیچیدہ صورت حال کو شاعری بنایا ہے-پروین شکست ذات کی اولین منزلوں سے گزر چکنے کے بعد ایک ایسے دور میں داخل ہو چکی تھیں جہاں ذاتی اور غیر ذاتی محسوسات بھی محض زاویہ نگاہ اور اسلوب کا معاملہ بن جاتے ہیں-زیادہ بہتر اور گہرا تجربہ کی معنویت اور اطلاعات کی تقسیم کرتا ہے-پروین کی شاعری میں سانپ بن کر ڈسنے والی تنہائی اور اجتماعی بلند حوصلگی کی خواہوں کے لیے علیحدہ علیحدہ خانے نہیں ہیں جو کچھ ہے اور جیسا ہے کفایت لفظی کے ساتھ سپرد قلم کر دیا جاتا ہے لیکن

کچھ اس طرح کہ زندگی پر پیار آ جاتا ہے۔ پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعری کا روپ دھارتی نظر آئی اور یہ بذات خود قابل مبارک باد کامیابی ہے۔ افسوس ! زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا اور 26 دسمبر کو یہ عظیم شاعرہ اسلام آباد، ایک حادثہ میں انتقال کر گئیں۔

(بشکریہ) محمد علی صدیقی

پروین شاکر کا منتخب کلام

سکون دل کے لئے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کہ سدا اس کی انجمن میں رہا

اوروں کا ہاتھ تھامو انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا

میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

وہ شہر میں ہے یہی بہت ہے
کس نے کہا میرے گھر بھی ٹھہرے

ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

اس ترک رفاقت پہ پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جا رہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

ایکسٹیسی

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر، آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
گرمیِ رخسار سے دہکی ہوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں بانہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف ایک دعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں، ٹھہر جائیں ذرا!!

پروین شاکر

چاند رات

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اس کا چہرہ دیکھا تھا

فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیض کا مصرعہ تھا

دعا کے بے آواز، الوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا

ہاتھ اٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا

پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر
کتنے پیار سے میرا ماتھا چوما تھا

ہوا! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا؟

یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی اور اس نے
چاند کو دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا!

بس اتنا یاد ہے

دعا تو جانے کون سی تھی
ذہن میں نہیں
بس اتنا یاد ہے
کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں
جن میں ایک میری تھی
اور اک تمہاری

اعتراف

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیئے آہستہ سے

پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب تنہائی کی

تو سمندر ہے تو پھر آنکھ میں سمٹا کیسے
تو فلک ہے تو بتا تیرے کنارے کیوں ہیں
نہیں نہیں یہ خبر دشمنوں نے دی ہوگی
وہ آئے آ کے چلے بھی گئے ملے بھی نہیں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

صائمہ خان

(کمپیوٹر آپریٹر و شاعرہ)

جدوجہد انقلابی تحریک کی نیشنل کمیٹی کی ممبر صائمہ خان جو کہ جدوجہد سنٹر سے ٹریڈ یونین ریسورس سنٹر میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب بھی کر رہی ہیں اور شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہیں۔ صائمہ کی شاعری میں حالات و واقعات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کا گہرا مطالعہ کرتی ہیں اور کبھی کبھی کام کرتے ہوئے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے بالکل بے خبر محو روزگار ہیں۔ صائمہ خان مستقبل میں شعبہ خواتین میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ رومانوی شاعری میں پروین شاکر کو بے حد پسند کرتی ہیں۔ مزید فہمیدہ ریاض، ادا جعفری اور فیض احمد فیض کا وسیع مطالعہ کر رہی ہیں۔ صائمہ خان اپنی شاعری میں خواتین سے متعلق سیاسی و شعوری خیالات کی عکاسی اگر کریں تو شاعری کے ذریعے وہ اپنے پیغامات کو بہتر طریقے سے پھیلا سکتی ہیں۔

فاروق طارق

درج ذیل شعر و نظم، ہر ایک میں ایک علیحدہ خیال پیش کیا گیا ہے۔

قید کر دو سب پرندے خواہشوں کے
خیال رکھنا! دیار یار میں نہ جائے کوئی

وہ دوست نہ بھرتے ہیں پیمانہ تنہائی
تجھ کو ہے بڑا زعم، وہ پیار کرتے ہیں

اگر ممکن ہوا تو...

زرد پتوں کی بہاروں میں
اگر جی نہ لگے
مجھے آواز مت دینا
مجھے تم یاد مت کرنا
فقط احساس کر لینا
کہ میں ساجن تیرے اطراف میں
پھیلی ہوں خوشبو کی طرح
گلوں کے پیرہن کی قید سے آزاد ہو جانا
اگر ممکن ہوا تو
میرے ہمدم!
میں تیری آنکھ میں پھیلے ہوئے
نیلے جہانوں میں
ذرا!
پرواز چاہوں گی

صائمہ خان

ٹوٹے دل کا حال سنانا کیا ہوتا ہے
چہرے پہ یہ زخم سجانا کیا ہوتا ہے

تم بدلے تو میرا لہجہ بدل گیا ہے
آوازوں کا شہر سجانا کیا ہوتا ہے

اپنا جان کے ملتی ہوں میں بیگانوں سے
دھرتی اور آکاش ملانا کیا ہوتا ہے

گرتے دیکھے پتوں سے شبنم کے قطرے
تب جانا کہ اشک بہانا کیا ہوتا ہے

فٹ پاتھوں پہ موت بھی آہیں بھرتی ہے
بھوکے ننگے بھی جی جانا کیا ہوتا ہے

صائمہ خان